ایک باپ کی اولاد
یہودی/عرب
مسائل اور ادب
(مضامین، شاعری، تراجم)
خالد سہیل / جاوید دانش

ڈاکٹر خالد سہیل کی تصانیف

تلاش (شاعری)

زندگی میں خلا (افسانے)

بریکنگ دی چینز (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

اک پیر وچ زنجیر (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)

سوغات (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ)

بھگوان، ایمان، انسان (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)

مغربی عورت، ادب اور زندگی

(مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ)

چنگاریاں (افسانوں کا کیسٹ)

تازہ ہوا کا جھونکا (شاعری) کا کیسٹ

ایک کلچر سے دوسرے کلچر [illegible] کا کیسٹ)

ٹوٹا ہوا آدمی (دو ناولٹ)

انفرادی اور معاشرتی نفسیات (مضامین)

ورثہ (عالمی کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)

امن کی دیوی (مشرقِ وسطیٰ / خلیج ۹۰/۹۱ کی جنگ)

ایک باپ کی اولاد (عرب / یہودی مسائل)

ایک باپ کی اولاد

یہودی / عرب

مسائل اور ادب

(مضامین۔ شاعری۔ تراجم)

خالد سہیل

جاوید دانش

گورا پبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور

ناشر : طاہر اسلم گورا

طبع اوّل : ۱۹۹۴ء

اہتمام : محیط اسمٰعیل

فی نسخہ : ۱۵۰ رُپے

Cover by : Sean Mc Quay

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز ۲۵ لوئر مال، لاہور

ان

ادیبوں کے نام

جنھوں نے

مظلوموں کے حق میں

خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مسلمان

خواہ اسرائیلی ہوں کہ فلسطینی

آواز اٹھائی

انسانی ضمیر کو جھنجھوڑا

اور

تعصبات کی دیواریں ڈھا کر

انسان دوستی کے پُل

تعمیر کرنے کی سعی کی

ترتیب

پانچواں باب

نواں باب

عرب/فلسطینی شاعری کے تراجم (خالد سہیل)

دسواں باب

گیارھواں باب

نثری تخلیقات کے تراجم / جاوید دانش

بارھواں باب

تیرھواں باب

پہلا باب

ذاتی تاثرات

عاجزانہ کوشش

چند سال پیشتر جب میں مشرقِ وسطیٰ کے سفر سے لوٹا تو اپنے ساتھ یہودی اور عرب شاعروں اور ادیبوں کی بہت سی کتابیں لے آیا۔ ان شعری اور نثری تخلیقات اور ان کے تراجم کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والی قوموں میں، چاہے وہ یہودی ہوں یا عرب، کتنے دکھ سانجھے ہیں اور وہ قومیں جو بظاہر دشمن نظر آتی ہیں اور ایک دوسرے سے کئی جنگیں لڑ چکی ہیں درپردہ ایک ہی طرح کی جدوجہد کرتی آئی ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں میں نے عرب اسرائیل تضاد کے بارے میں جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں یا تو یہودیوں اور اسرائیلیوں سے اور یا عربوں اور فلسطینیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ میری نگاہ سے کوئی کتاب ایسی نہیں گزری جس میں دونوں قوموں کے موقف کی ترجمانی کی گئی ہو۔

چنانچہ میں خود بھی اس سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میری منزل ایسی کتاب تھی جس سے دونوں قوموں کی تاریخ، مصائب، نقطۂ نظر اور تجربات کا اندازہ ہو سکے۔ اس راستے میں مجھے جاوید دانش بھی مل گئے اور وہ بھی میرے ساتھ چند قدم چلے۔

جن لوگوں نے ہماری کتاب "کالے جسموں کی ریاضت" کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جاوید دانش اس سے پہلے بھی میرے ادبی ہمسفر رہ چکے ہیں۔ میں نے یہودی اور عرب مسائل پر شعری اور نثری تخلیقات کے تراجم اور چند طبعزاد تخلیقات سے ایک ایسا کولاژ تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کے آئینے میں ہمیں اس دھرتی کی چند جھلکیاں نظر آئیں گی جو مقدس ہونے کے باوجود خون میں لت پت ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کے چہرے بھی نظر آئیں گے جو ایک باپ ابراہیم کی اولاد ہوتے ہوئے بھی رقابتوں اور نفرتوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں اور مسخ ہو گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب میری پچھلی کتاب "امن کی دیوی" کی طرح مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کو وسیع پس منظر میں دیکھنے میں مدد کرے گی۔

جب میں اس کتاب کا آخری باب لکھ رہا تھا تو مجھے یہ خوشخبری ملی کہ اسرائیل اور فلسطین کے نمائندوں نے امریکہ میں ایک دوسرے کی طرف خلوص کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ میری نگاہ میں یہ امن کی منزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ان گنت قربانیوں کے باوجود ایک دن مشرقِ وسطیٰ کے باسی چاہے وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مسلمان، مل جل کر رہیں گے اور آپس میں امن اور آشتی کے رشتے استوار کریں گے۔ یہ کتاب اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

خالد سہیل
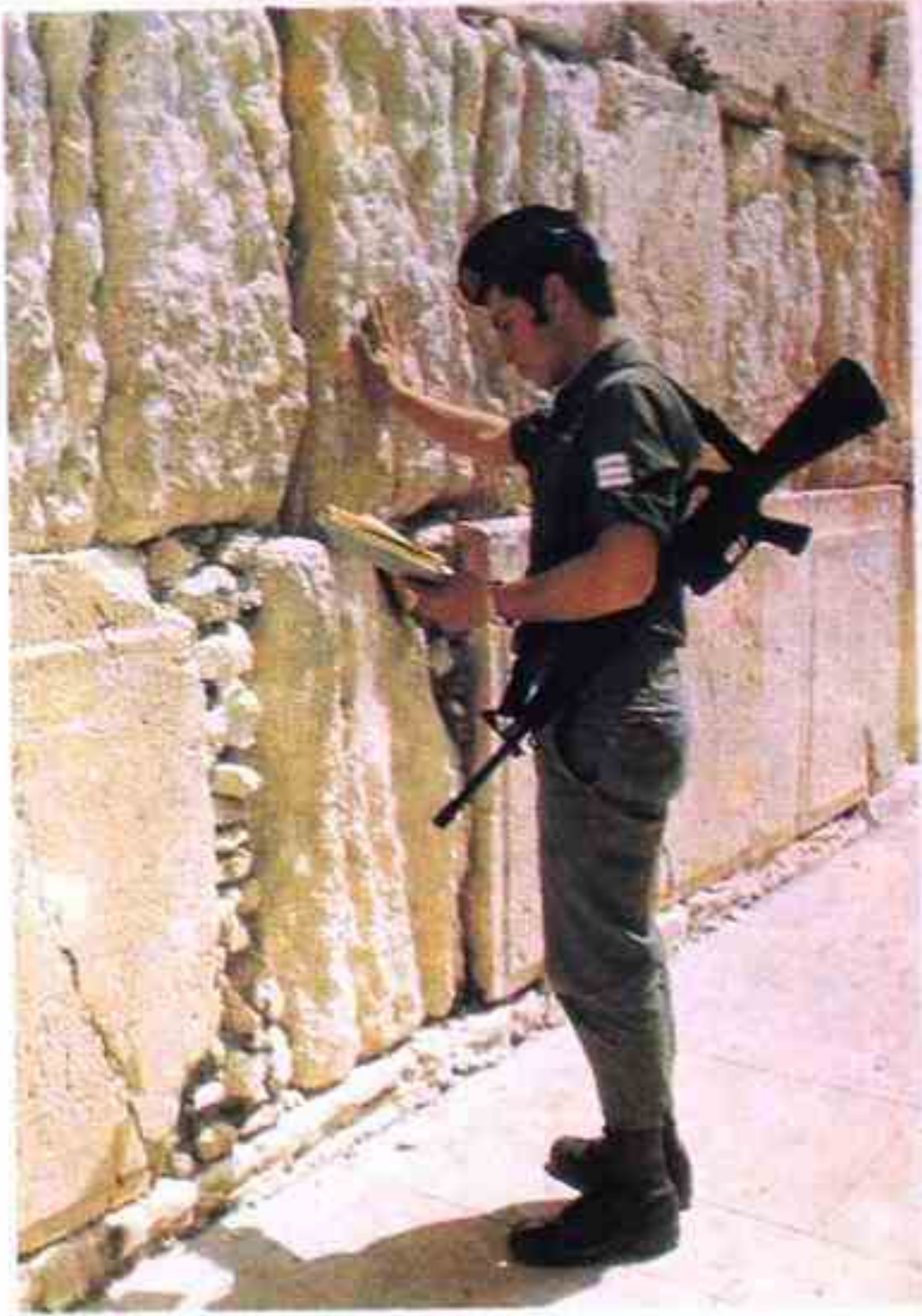
دیوارِ گریہ اور ایک فوجی

اسرائیل

نفرت بھی عجب اور محبت بھی عجب تھی
اس شہر میں قربت کی روایت بھی عجب تھی

دیواریں تھیں ہمراز مگر دل میں خلیجیں
ہمسایوں کی آپس میں رقابت بھی عجب تھی

اک باپ کی اولاد مگر خون کے پیاسے
دشمن تھے مگر ان میں شباہت بھی عجب تھی

خاموشی کا ہر لمحہ وہاں چیخ رہا تھا
آوازوں کی بستی میں بغاوت بھی عجب تھی

معصوم جبینوں پہ ملے خون کے چھینٹے
اور اس پہ ستم خون کی رنگت بھی عجب تھی

جو شخص ملا کانچ کا پیکر لگا مجھ کو
اور کانچ کی پتھر سے رفاقت بھی عجب تھی

ہر نسل نئی نسل کو دیتی رہی ہتھیار
اس شہر میں خالد یہ وراثت بھی عجب تھی

خالد سہیل

تین سپاہی

شہرِ یروشلم کے تین کونوں میں بیک وقت تین سپاہی بندوقوں سے لیس عبادت میں مصروف تھے۔

یہودی سپاہی "اے موسیٰ کے خدا! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ یہودی پیدا ہوا، میری زندگی کا مقصد تیرے فرمان پر عمل کرنا اور تیرے کلام کا بول بالا کرنا ہے۔ اے خدا! تو مجھے اتنی ہمت دے کہ میں عیسائی اور مسلمان سپاہیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کروں اور ان کے سر قلم کر دوں۔ یہ شہر ہماری پانچ ہزار سالوں کی میراث ہے۔"

عیسائی سپاہی: "اے عیسیٰ کے خدا! میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے ہمیں اپنا بیٹا دے کر نوازا، ہم اس پر ایمان لا کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ میری زندگی کا مقصد اس شہر کی حفاظت کرنا ہے جہاں تیرے بیٹے کو یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا تھا۔ میں اس کی حفاظت کے لیے جان کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ اے خدا! مجھے اتنا حوصلہ دے کہ میں یہودی اور مسلمان سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔"

مسلمان سپاہی: "اے محمد کے خدا! میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ امتِ محمدیہ میں پیدا ہوا۔ میرے لیے یہ باعثِ فخر ہے کہ میں اس جگہ رہتا ہوں جہاں محمد شبِ معراج کو تجھ سے ملنے گئے تھے، اس شہر کی حفاظت میرا دین و ایمان ہے۔ اے خدا! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں یہودی اور عیسائی سپاہیوں کو یہاں سے مار بھگاؤں یا صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دوں۔"

خالد سہیل

یروشلم

ابراہیم کا شہر کہ جس کی
بنیادوں کو محکم کرنے
امن نے مٹی، عشق نے گارا
قربانی نے پتھر ڈالے

ابراہیم کا شہر کہ جس کی
دیواروں کو اونچا کرنے
عیسیٰ علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
اپنی اپنی اُمت لائے

ابراہیم کا شہر کہ جس کے
میناروں کا حسن بڑھانے
فنکاروں نے برسوں مل کر
کیسے کیسے نقش بنائے

آج جو میں اس شہر سے گزرا
ایک عجب ہی منظر دیکھا
بنیادوں کو خون اُگلتے
دیواروں کو گریہ کرتے

میناروں کو آہیں بھرتے
ہمسایوں کو لڑتے دیکھا
انسانوں کو مرتے دیکھا

(۱۹۸۶)

خالد سہیل

دوسرا باب

یہودیوں کے مسائل

ژاں پال سارتر

خالد سہیل

یہودی اور اینٹی سیمائٹ

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کے انفرادی اور معاشرتی مسائل کی وجہ اس کے ملک میں یہودیوں کی موجودگی ہے اور اگر وہ یہ بھی سمجھے کہ یہودیوں کو حقوق اور مراعات سے محروم کرنے سے یا ان کی معاشی اور معاشرتی کاروائیوں پر پابندی لگانے سے یا انہیں ملک بدر کرنے سے وہ مسائل حل ہو جائیں گے تو ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی رائے اینٹی سیمیٹک (Anti-Semitic) ہے۔

اس مقام پر لفظ "رائے" قابلِ غور ہے۔ اس سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ یہ ایک معصوم سی چیز ہے اور چونکہ ایک جمہوری معاشرے میں ہر شخص کو اپنی جداگانہ رائے رکھنے کا حق ہے اور ہم لوگوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ دوسروں کی پسند، ناپسند کا احترام کریں اس لئے ہمیں اس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن جب ہم اس موضوع اور ایسے شخص پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ جمہوریت اور آزادیِ فکر و عمل کے نام پر ایسا شخص یہودیوں کے خلاف اپنا تعصب پھیلاتا رہتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص یہودیوں کے بارے میں متعصب ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کی پوری شخصیت ہی ناپسندیدہ ہے۔ ایسا شخص ایک مہربان باپ، ایک اچھا شوہر، ایک فراخدل انسان اور افریقیوں کے مسائل کے بارے میں ہمدرد ہو سکتا ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ اینٹی سیمائٹ بھی ہوتا ہے۔ یہودیوں کے خلاف تعصب کے جذبات اس کی ذات اور شخصیت کا صرف ایک حصہ ہوتے ہیں۔

جب ہم کسی اینٹی سیمائٹ سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ اپنے موقف کے حق

میں ایسے تاریخی شواہد اور اعداد و شمار کا ذکر کرتا ہے جن کا اس کے ذاتی تجربے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ کسی یہودی کو اس لیے ناپسند نہیں کرتا کہ اس سے اسے نظریاتی اختلاف ہے وہ اسے اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ وہ یہودی ہے، ایک مخصوص جسمانی ساخت، بالوں اور آنکھوں کے رنگ کا مالک ہے اور یہودیوں کے خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ اسی سے ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ یہودیوں کے خلاف تعصب ایک رائے نہیں ہے جس کا آزادیِ رائے کی بنیادوں پر دفاع کیا جا سکے، وہ تعصب تو ایک جنون کی سی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ جنون ذرا کم ہو وہ پہلے تو سرگوشی کے عالم میں کہتے ہیں۔ "ذاتی طور پر میں یہودیوں سے نفرت نہیں کرتا لیکن اگر وہ ملک کے معاملوں میں کم دخل اندازی کریں تو اچھا ہو" لیکن جب وہ بے تکلف ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں "یہودیوں کے بارے میں کوئی تو چیز ایسی ہے جس سے میرے جسم میں ایک ناخوشگوار ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔"

ان لوگوں کی یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ یہ دلیل جنون کی دلیل ہے جس کا تعلق عقل کی نسبت جذبات سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض مرد جب عورتوں سے ہم بستری کرنے لگے اور انہیں عورتوں نے بتایا کہ وہ یہودی ہیں تو وہ نامردی کا شکار ہو گئے تھے، لیکن یہ ردِ عمل ایسا نہیں ہے جس کا آغاز جسم سے ہو کیونکہ ایک انسان ایک یہودی کے ساتھ اس وقت تک محبت کر سکتا ہے جب تک اسے پتہ نہ چلے کہ وہ یہودی ہے۔ یہ ردِ عمل بنیادی طور پر ایک نفسیاتی ردِ عمل ہے لیکن کبھی کبھار جسم کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

اس جذباتی اور نفسیاتی ردِ عمل کے درپردہ ایسی توجیہات اور عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن کا ان کے ذاتی تجربے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر آپ ایسے

لوگوں سے پوچھیں کہ وہ یہودیوں ہی سے اتنا تعصب اور نفرت کیوں کرتے ہیں تو وہ کچھ اس قسم کے جواب دیتے ہیں۔

"وہ خود غرض اور مکار ہیں۔"

"وہ ہمارے ملازموں کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔"

"ان کی موجودگی میں ہم ترقی نہیں کر سکتے۔"

ایک اینٹی سیمائٹ کے اعصاب پر یہودی اتنا سوار ہو جاتا ہے کہ جہاں یہودی نہ ہو وہاں وہ اسے خود پیدا کر لیتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ اپنے موقف کے حق میں تاریخی حوالے بھی پیش کرتے ہیں۔ جب ہم فرانس کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک یہودیوں کو دبا کر رکھا گیا تھا اور انہیں ملکی معاملات میں بھرپور حصہ لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اگرچہ انہوں نے فرانس کے خلاف نہ کبھی غداری کی تھی اور نہ ہی ملکی مفاد کے خلاف کوئی کام کیا تھا۔ جب متعصب لوگ تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں تو وہ تاریخی شواہد اور حقائق پیش نہیں کرتے بلکہ تاریخ کی اپنی تفسیر پیش کرتے ہیں جو اکثر اوقات غیر منصفانہ ہوتی ہے۔

اینٹی سیمائٹ اپنے تعصب کے حق میں معاشرتی حقائق بھی پیش کرتے ہیں "ہمارے ملک میں بہت سے یہودی وکیل ہیں" اور اگر کوئی اس کے جواب میں کہے "تو پھر کیا ہوا ہمارے ملک میں بہت سے جرمن انجینیر اور برٹش ڈاکٹر ہیں۔" تو وہ کہیں گے "یہ ایک ہی بات نہیں ہے کیونکہ وہ یہودی نہیں ہیں" اس لئے یہ "یہودی ہونے کا تصور" اس مسئلے کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

جب ہم اینٹی سیمائٹ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں مزید غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس کے متعصب جذبات کسی خارجی دباؤ کے تحت

وجود میں نہیں آتے، وہ آزادی سے ایسے اندازِ فکر اور رویے کو اپناتا ہے اور یہ رویہ صرف یہودیوں کی طرف نہیں بلکہ پوری تاریخ، معاشرے اور انسانیت کی طرف ہوتا ہے۔ یہ رویہ بیک وقت ایک جنون کی بھی اور ایک نقطۂ نظر کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ کے تعصب میں غصے اور نفرت کے جذبات ایک مخصوص شدت کے حامل ہوتے ہیں۔ ویسے تو غصے اور نفرت کے جذبات انسانی زندگی کا حصہ ہیں لیکن اکثر اوقات وہ جذبات کسی ناخوشگوار واقعہ کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اگر کوئی ہماری توہین کرے یا گزند پہنچائے تو ہمارا غصے میں آنا ایک فطری عمل ہے لیکن اینٹی سیمائٹ شخص میں ایسا نہیں ہوتا اس کے جذبات واقعات کے بعد نہیں بلکہ پہلے ظاہر ہوتے ہیں اور وہ ان جذبات کی روشنی میں حالات کی تشریح کرتا ہے۔

کسی انسان کا عقل و دانش کی راہ چھوڑ کر جنون کی زندگی گزارنا کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اکثر اوقات وہ جنون یا تو عورتوں کا ہوتا ہے یا شہرت کا، طاقت کا یا کسی اور چیز کا لیکن چونکہ اینٹی سیمائٹ کو نفرت کا جنون ہوتا ہے اس لیے ایسا لگتا ہے جیسے وہ نفرت سے محبت کرتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ کا زندگی کے حقائق سے ایک عجیب و غریب رشتہ ہوتا ہے وہ ایسے جذبات کا حامل ہوتا ہے جو اس کے اور حقائق کے درمیان حائل ہوتے ہیں اور وہ حقائق اس کے اپنے مشاہدات اور تجربات سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس کے نفرت کے جذبات میں آہستہ آہستہ ایمان کی سی پختگی آجاتی ہے اور پھر وہ عقل یا دلیل سے متاثر نہیں ہوتے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایسا نہیں کہ اینٹی سیمائٹ کا ایمان اتنا پختہ

ہوتا ہے کہ وہ عقل اور دلیل سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ معاملہ اس کے بالکل الٹ ہے چونکہ اینٹی سیمائٹ عقل سے آنکھیں چراتا رہتا ہے اس لئے اس کا اعتقاد مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

اکثر اوقات لوگ ایسے شخص سے خوفزدہ رہتے ہیں اور اسے چیلنج کرتے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو انسان دوسرے انسانوں پر کیچڑ اچھال سکتا ہے وہ انسانیت کی تکریم کیسے کر سکتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہودی قابل انسان ہیں، محنتی ہیں اور کئی چیزوں میں اس سے بہتر ہیں لیکن وہ ان خوبیوں کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ جتنی خوبیوں کے مالک ہیں وہ اتنے ہی خطرناک ہیں۔ اینٹی سیمائٹ کبھی اپنے آپ کو یہودیوں سے بہتر ثابت نہیں کرتا لیکن اپنے آپ کو عوام میں سے ایک ثابت کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے اور یہودیوں کو عوام میں سے الگ ایک گروہ ثابت کر کے ان سے نفرت کرتا ہے۔

اگر ہم اینٹی سیمائٹز کا قریبی مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت نچلے درمیانے درجے (Lower middle class) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ یا تو دفتروں میں کام کرتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے بیوپار کرتے ہیں' ان کے پاس زیادہ دولت نہیں ہوتی۔ جب وہ یہودیوں کو صاحبِ ثروت دیکھتے ہیں تو وہ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے یہودی ڈاکو ہوں اور انہوں نے ان کی دولت چرائی ہو اس لئے اینٹی سیمائٹ یہودیوں کی دولت سے اسی طرح نفرت کرتا ہے جیسے وہ یہودیوں کی قابلیت سے نفرت کرتا ہے بعض دفعہ یوں لگتا ہے جیسے اینٹی سیمٹزم (Anti-semitism) کا جذبہ غریب آدمیوں کے غرور کا ترجمان ہو شاید اسی

لیے جرمن میں جو لوگ اقتصادی طور پر زیادہ کامیاب نہ تھے تعصب کے جذبات لیے ہوئے تھے۔

اینٹی سیمائٹ جب کسی طرح یہودیوں کو نیچا دکھاتا ہے تو غیر ارادی طور پر اپنی اہمیت بڑھا رہا ہوتا ہے لیکن یہ اہمیت ایسی نہیں جسے اس نے برسوں کی مشقت اور محنت سے کمایا ہو۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیتا ہے کہ یہودی کچھ بھی کریں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ اینٹی سیمائٹ لاشعوری طور پر اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے یہودیوں کے وجود کو استعمال کرتا ہے کیونکہ اینٹی سیمائٹ بنیادی طور پر درجہ بندی کا قائل ہوتا ہے۔ اگر ملک سے تمام یہودیوں کا وجود ختم ہو جائے تو اینٹی سیمائٹ مالیخولیا کا شکار ہو جائے، کیونکہ بد قسمتی سے اینٹی سیمائٹ اپنی ذہنی صحت کے لیے اپنے دشمن کے وجود کا محتاج ہوتا ہے۔

اگرچہ اینٹی سیمائٹ بظاہر جمہوریت اور برابری کا متمنی نظر آتا ہے لیکن اگر آپ اس سے ملکی حالات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں تو اکثر اوقات وہ معاشرے کے معاشی مسائل، اقتصادی عوامل اور مختلف گروہوں کے تعلقات کے گنجلک رشتوں کی بصیرت سے ناواقف ہوتا ہے وہ صرف باقی اینٹی سیمائٹ لوگوں سے نفرت کے رشتے میں منسلک ہوتا ہے۔

یہودیوں کے خلاف تعصب معاشرے میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے بعض دفعہ اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور نفرت کے شعلے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں لیکن اکثر اوقات وہ جذبات در پردہ سلگتے رہتے ہیں۔ اینٹی سیمائٹ جب یہودیوں پر زبانی یا جسمانی طور پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ قانون کی زد سے بچا رہے اور اگرچہ وہ اوروں کو قانون کی پیروی کی تبلیغ کرتا ہے لیکن خود اس سے کترا کر نکل جانا چاہتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ اپنے ذہن میں ملک کے دو نظام لیے ہوئے ہوتا ہے ایک وہ نظام جو الیکشن، سیاسی نمائندوں اور حکومت پر مبنی ہوتی ہے اور وہ نظام جو درپردہ یہودی چلارہے ہوتے ہیں اور اینٹی سیمائٹ اس خفیہ نظام کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے لیکن اینٹی سیمائٹ یہ بغاوت تنہا نہیں کرنا چاہتا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر کرنا چاہتا ہے جو اس کی طرح یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے جذبات اور اعمال کی ذمہ داری لینے سے کتراتا ہے۔ جب ہم اس طرزِ عمل پر مزید غور کرتے ہیں تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے اینٹی سیمائٹ سیاسی بدامنی پیدا کرنا چاہتا ہے اور ملک سے یہودیوں کا خروج چاہتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے غصہ، نفرت، بدمعاشی، مار دھاڑ اور طاقت کے ناجائز استعمال کو جائز سمجھتا ہے۔ اگر تو ملک کی حکومت مضبوط ہو تو ایسے لوگوں اور جذبات کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا لیکن اگر حکومت میں خود ہی اینٹی سیمیٹک عناصر موجود ہوں تو پھر تعصب بہت سے گل کھلاتا ہے۔

ہم نے اینٹی سیمائٹ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ کہا تھا کہ اس کا تعصب ایک جنونی کیفیت رکھتا ہے وہ یہودیت کو سراپا برائی سمجھتا ہے اور اس سے متعلق ہر چیز سے نفرت کرتا ہے اس لیے اگر کسی یہودی نے کوئی پل بنایا ہو تو وہ اس پر اعتراض کرتا ہے۔ وہی پل اگر اسی طرح کوئی عیسائی بناتا تو وہ ٹھیک ہوتا لیکن چونکہ اس کا معمار یہودی ہے اس لئے وہ ناقابلِ قبول اور قابلِ نفرت بن جاتا ہے۔

نازیوں نے یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے "یہودی سرمایہ داری" کے تصور کو فروغ دیا تھا کیونکہ مزدور طبقے میں یہودیوں کے خلاف نفرت نہ تھی، وہ صرف سرمایہ داروں کو استحصال کرنے والا سمجھتے تھے اور اینٹی سیمائٹ

لوگوں کی اکثریت درمیانے درجے سے تعلق رکھتی تھی اور بورژوا تھی۔ اس لئے وہ مزدوروں کو یہودیوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے۔ بعض دفعہ یوں لگتا ہے جیسے اینٹی سیمیٹزم ایک بورژوا عمل ہو جو تاریخ کی تشریح اور تفسیر میں معاشرتی اور اقتصادی عوامل اور طاقتوں کو کم اور افراد کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس طرح ان کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک اینٹی سیمائٹ یہودیوں سے ایسے ہی نفرت کرتا ہے جیسے ایک پرولتاری بورژوا لوگوں سے لیکن یہ مماثلت ظاہری ہے کیونکہ پرولتاری ان تاریخی اور معاشرتی عوامل کے خلاف ہے جس کی وساطت سے بورژوا اس کا استحصال کرتا ہے لیکن ایک اینٹی سیمائٹ یہودی سے معاشرتی یا اقتصادی حالات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی یہودیت کی وجہ سے نفرت کرتا ہے۔ ہم کیسے مان لیں کہ ایک یہودی تاجر ملک کی تباہی چاہتا ہے جبکہ یہودی تاجر کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے اقتصادی حالات بہتر ہوں۔ اینٹی سیمائٹ ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہودی ساری دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور بین الاقوامی سرمایہ داری یہودیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

اینٹی سیمائٹ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ یہودیوں کو برا، شیطان اور بدفطرت ثابت کرے وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جب یہودی کو نیکی اور بدی کے درمیان انتخاب کرنے کی آزادی ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ بدی کا انتخاب کرتا ہے، اس طرح یہودی آزاد لیکن برائی کی زنجیر سے بندھا نظر آتا ہے۔ اینٹی سیمائٹ یہودیوں کو برائی کی جڑ اور تمام جنگوں، قحطوں، بغاوتوں اور بحرانوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ جب دو ممالک آپس میں جنگ کریں تو بجائے یہ کہنے کے کہ دونوں ملکوں کے سیاسی اور قومی مفادات میں تضاد ہے، اینٹی سیمائٹ یہ ثابت کرنے کی

کوشش کرتا ہے کہ ان حکومتوں کے پس پردہ یہودی انہیں جنگ اور بدامنی پر اکسا رہے ہیں۔

اینٹی سیمائٹ کی سوچ دنیا کی جنگ کو خیر اور شر کی جنگ، یہودیوں کو شر اور خیر کی کامیابی کے لیے شر کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے اس لیے اینٹی سیمائٹ یہودیوں کو اپنے ملک اور دنیا سے نیست و نابود کرنے کا جواز تلاش کرتا رہتا ہے۔

جب ہم مارکس کی طبقاتی جدوجہد کا اینٹی سیمائٹ کی بغاوت سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مارکس کے پیروکار طبقاتی جدوجہد کو خیر اور شر کی جنگ نہیں سمجھتے بلکہ اسے دو انسانی گروہوں کے درمیان جنگ قرار دیتے ہیں جس میں ایک گروہ دوسرے گروہ کا استحصال کر رہا ہوتا ہے اور امید رکھتے ہیں کہ جب طبقات کی یہ جنگ ختم ہو گی تو ایسے معاشرے کا قیام ہو گا جہاں کوئی گروہ دوسرے گروہ کا استحصال نہیں کرے گا، وہ معاشرے کو بدلنا چاہتے ہیں اور ایک پر امن اور منصفانہ نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں وہ پرانے نظام کو ختم کر کے نئے نظام کی تشکیل چاہتے ہیں اور بورژوا گروہ کے وہ لوگ جنہیں مظلوموں سے ہمدردی ہو، انہیں پرولتاوی گروہ خوش آمدید کہہ کر اپنا شریکِ سفر بنانا چاہتے ہیں لیکن اینٹی سیمائٹ کی بغاوت میں تخریب کے عناصر تو بہت ہیں تعمیر کا عنصر کوئی نہیں۔ ان کی نگاہ میں خیر کی بقا صرف شر کی تباہی میں مضمر ہے، یہ منفی سوچ اور عمل ہے۔۔۔۔ اس لئے خیر کے ماحول میں خیر پسند یہودیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں اور اینٹی سیمائٹ کی نگاہ میں کوئی یہودی خیر پسند تو ہو ہی نہیں سکتا۔

اینٹی سیمائٹ کبھی کبھار اپنی اس متعصبانہ جنگ کو مذہبی رنگ بھی دے دیتا ہے اور یہودیوں کی تباہی کو مذہبی جنگ یا خیر کی جنگ یا شر کے خلاف جنگ

یا جہاد کا نام بھی دے دیتا ہے۔ اینٹی سیمائٹ بنیادی طور پر ایک کوتاہ نظر انسان ہوتا ہے جو معاشرے کے مسائل کو بڑے کینوس پر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تمام تر تاریخی شواہد میں اس شر کو تلاش کرتا رہتا ہے جن سے اس کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔ وہ ریت کی دیواروں پر ایسا محل تعمیر کرتا ہے جس سے اس کے پیرانویا (Paranoia) کو تقویت ملتی ہے وہ مختلف نظاموں یا تحریکوں سے اختلاف کرنے کی بجائے افراد کو تباہ کرنے پر زور دیتا رہتا ہے اور جب کسی مشتعل ہجوم کا حصہ بنتا ہے تو یہودی انسانوں اور ان کی عبادت گاہوں کو برباد کر کے خوشی کے جشن مناتا ہے۔ اینٹی سیمائٹ کی زندگی کا سارا مقصد شر کی بربادی ہے وہ خیر کی تخلیق کا کرب اور محنت برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ساری عمر شر سے لڑتا رہتا ہے وہ خیر کے بارے میں زیادہ فکر مند نہیں ہوتا وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ شر کو کم کرنے سے خیر خود بخود بڑھ جائے گا۔ اگر ہم اس طرزِ زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اینٹی سیماوٹ شر سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے وہ ہر وقت شر کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور اس کی تباہی کے منصوب بناتا رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں شر یہودیوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ اینٹی سیمائٹ کا خیر اور محبت سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

اینٹی سیمائٹ کا شر سے لگاؤ در حقیقت سادیت (Sadism) کی ایک قسم ہے۔ وہ ہم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ یہودی مجرم ہیں، گنہگار ہیں، بدکار ہیں اور در پردہ ہمارے معاشرے کی تباہی کے ضامن ہیں اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ یہودیوں کو نقصان پہنچائے اور پھر اس سے لطف بھی حاصل کرتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ یہودیوں سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ وہ جن یہودیوں کے قریب آتا ہے ان کے بارے میں کہتا ہے "یہ یہودی بہت اچھے ہیں یہ باقی

یہودیوں کی طرح نہیں ہیں" اور پھر ان کی خوبیاں گنواتا ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ باقی یہودیوں میں بھی وہی خوبیاں موجود ہو سکتی ہیں۔

اینٹی سیمائٹ درپردہ ایک مجرم کا ضمیر رکھتا ہے، وہ یہودیوں کی موت چاہتا ہے لیکن اکثر اوقات وہ اپنی نفرت کی اس شدت کو چھپا کر رکھتا ہے اور صرف ان کی توہین پر ہی اکتفا کرتا ہے، وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی نفرت اور جارحیت نیک مقاصد کا حصول ہے وہ خیر اور شر کی عدالت میں خود ہی منصف بھی بنتا ہے اور خود ہی جلاد بھی۔ اس کی زندگی کا مقصد شر کو نیست و نابود کر دینا بن جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے دل میں قاتلانہ جذبات پنپتے رہتے ہیں لیکن وہ ان کی تشریح اس انداز سے کرتا ہے جیسے ان کا مقصد خیر کی بقا ہو۔ وہ یہودیوں کو تباہ و برباد کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتا ہے۔

اینٹی سیمائٹ جس محفل میں جاتا ہے اس کے دوست یہودیوں کے مسائل پر تبادلہِ خیال نہیں کرتے اور خاموش ہو جاتے ہیں، وہ اینٹی سیمائٹ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے اس طرح اینٹی سیمائٹ یہودیوں کے خلاف غصے، تعصب اور نفرت کی فضا کو برقرار رکھتا ہے۔ اگرچہ نیک دل لوگوں کی خاموشی اینٹی سیمائٹ کے تعصب کا معاشرتی ردِ عمل ہے لیکن ایسے ردِ عمل سے تعصب نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔

اپنے اس تفصیلی تجزیے کے آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اینٹی سیمائٹ ایک خوفزدہ شخص ہوتا ہے لیکن وہ یہودیوں سے نہیں اپنی ذات سے خوفزدہ ہوتا ہے--- اپنے ضمیر سے--- اپنی آزادی سے--- اپنی ذمہ داریوں سے--- اپنے معاشرے سے--- ہر چیز سے سوائے یہودیوں کے---

اینٹی سیمائٹ:

—— ایک بزدل انسان ہوتا ہے لیکن اپنی بزدلی کو قبول نہیں کر سکتا۔

—— وہ قاتل ہوتا ہے لیکن اپنے قاتلانہ رجحانات کو چھپا کر اور دبا کر رکھتا ہے۔

—— وہ اپنے داخلی تضادات کا حل یہودیوں کے خلاف تعصب میں تلاش کرتا ہے اور اسے اپنا نقطۂ نظر اور لائحۂ عمل بنا کر زندہ رہتا ہے۔

—— ایک ایسی چیز پر ایمان رکھتا ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔

—— ساری عمر شر سے لڑتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں شر نے یہودیوں کا روپ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔

—— اگر اینٹی سیمائٹ دنیا کے کسی اور کونے میں رہ رہا ہوتا تو شاید اس کے ذہن میں یہودی کالوں کا یا کسی اور رنگ و نسل کے لوگوں کا روپ اختیار کر لیتے۔

—— مختصر یہ کہ اینٹی سیمائٹ ایسا انسان ہوتا ہے جسے انسانیت سے ڈر لگتا ہے۔ وہ انسانی معاشرے میں احترامِ آدمیت کی قدر کو قبول نہیں کر سکتا اور یہودیوں سے نفرت کی جنگ لڑتے لڑتے خود انسانیت کے معیار سے نیچے اتر آتا ہے۔

یہودی اور ڈیمو کریٹ

اس دنیا میں یہودیوں کا ایک ہی دوست ہے جو ڈیمو کریٹ (Democrat) یا جمہوریت پسند انسان کے نام سے پہچانا جاتا ہے لیکن وہ ایک کمزور دوست ہے۔ اگرچہ اس کا ایمان ہے کہ سب انسان برابر ہیں، کسی انسان کو دوسرے انسان کے حقوق کے استحصال کا حق نہیں اور کسی گروہ کے افراد کو حقوق و مراعات سے محروم نہیں کرنا چاہیے لیکن ان اعتقادات کے باوجود وہ یہودیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک کمزور ڈھال ہے۔

ڈیمو کریٹ ہر چیز کو تجزیاتی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ انسانوں کو صرف انسان کی صورت میں قبول کرتا ہے اور کسی کے یہودی ہونے، کالے ہونے، عرب ہونے، مزدور ہونے یا بورژوا ہونے سے انکار کرتا ہے، اس کے لیے سب لوگ انسان اور صرف انسان ہیں۔ وہ ہر انسان کو عالمی (Universal) خصوصیات کا حامل سمجھتا ہے۔

اس لیے جب ایک ڈیمو کریٹ اور اینٹی سیمائٹ آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو میں ابلاغ کی بہت سی خلیجیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بالکل سمجھ نہیں پاتے۔ وہ ایک دوسرے کے دلائل سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ اینٹی سیمائٹ یہودی انسان کی یہودیت کی بات کرتا رہتا ہے جبکہ ڈیمو کریٹ یہودی انسان کی انسانیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔

ایک ڈیمو کریٹ ایک سائنسدان کی طرح انسان کی ان خصوصیات میں دلچسپی لیتا ہے جو رنگ اور نسل اور مذہب سے بالاتر ہیں اس لیے وہ یہودی انسانوں کی انسانیت کی طرفداری تو کرتا ہے لیکن ان کے یہودی ہونے کو نظر انداز کرتا

رہتا ہے۔ ایک ڈیموکریٹ انسانوں کے گروہی شعور سے کتراتا ہے۔ اس لیے وہ یہودیوں کے یہودی شعور سے مزدوروں کے طبقاتی شعور کی بیداری کی طرح گھبراتا ہے۔ وہ اکثر اوقات گفتگو کے دوران کہتا ہے۔

''یہاں یہودی موجود نہیں ہیں۔''

''یہاں کوئی یہودی مسئلہ نہیں ہے۔''

وہ اپنے اس اندازِ فکر سے یہودی انسانوں کو ان کی نسلی، خاندانی، طبقاتی، مذہبی اور گروہی شناخت سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ یہودیوں کو تنہائی کے تہہ خانے میں بند کر دینا چاہتا ہے اور یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اس طرح وہ نسلی تعصبات سے رہائی حاصل کر لیں گے۔

امریکہ میں اس نقطۂ نظر نے مدغم ہونے کی پالیسی (Assimilation) کی صورت اختیار کی ہے جہاں لوگوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سب امریکی بن جائیں اور ہجرت سے پہلے کی نسلی، مذہبی اور گروہی شناخت کو بھول جائیں لیکن یہ پالیسی بری طرح ناکام ہوئی ہے۔

یہودی انسان اپنی انسانیت پر بھی فخر کرنا چاہتے ہیں اور اپنی یہودیت پر بھی ناز کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ اینٹی سیمائٹ اور ڈیموکریٹ دونوں سے نبرد آزما رہتے ہیں---- اینٹی سیمائٹ انہیں انسانیت سے اور ڈیموکریٹ انہیں ان کی یہودی شناخت اور وراثت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ہم اس تجزیے کو ذرا آگے بڑھائیں تو ہمیں لبرل ڈیموکریٹ بھی درپردہ تھوڑے سے اینٹی سیمائٹ نظر آتے ہیں وہ اگرچہ بظاہر تو یہودیوں کی طرفداری کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار ان کے بعض جملے ان کے جذباتی ردِ عمل کی چغلی کھاتے ہیں وہ نجی محفلوں میں کہتے ہیں:

"ہمیں یہودیوں کی ایک عادت اچھی نہیں لگتی اور وہ ان کا ہر جگہ گروہ بنا کر جانا ہے "یا" ہمیں اندازہ نہ تھا کہ یہودی اس شدت سے اپنے جذبات کا اظہار کریں گے کیونکہ اس سے اینٹی سیمائٹ تعصب کی آگ اور بھڑک اٹھے گی"

اینٹی سیمائٹ یہودیوں کے یہودی ہونے کی وجہ سے تعصب کرتا ہے اور ڈیموکریٹ انہیں یہودی لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہودی اپنے مطمئن اور محسن کے درمیان ایک عجب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

اس دشوار صورتِ حال میں جو اہم سوالات ہمیں آئینہ دکھاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

کیا ہم یہودیوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں؟

کیا ہم یہودیوں کو بالکل نیست و نابود (Exterminate) کر دینا چاہتے ہیں؟

کیا ہم یہودیوں کو معاشرے میں بالکل مدغم (Assimilate) کر دینا چاہتے ہیں؟

کیا ہمارے ذہن میں یہودی انسان --- پہلے یہودی ہیں یا پہلے انسان؟

کیا ہم ان کے مسائل کو حقیقت پسندانہ طریقے سے قبول کرنے کو اور ان کے حل تلاش کرنے کو تیار ہیں؟

یہودی -- چکی کے دو پاٹوں کے درمیان

ہم اینٹی سیمائٹ کی ایک بات سے اتفاق کرتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان کی کوئی ایک "فطرت" نہیں ہے ہمیں انسانوں کو سمجھنے کے لیے حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی سبھی عوامل پر غور کرنا پڑتا ہے تاکہ ہم انسانوں کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھ سکیں لیکن جب اینٹی سیمائٹ اس اصول کو یہودیوں پر لاگو کرتا ہے تو ہم اس سے اختلاف کرتے ہیں کیونکہ اینٹی سیمائٹ اپنی نفرت کی بنیاد ایسے اصولوں پر استوار کرتا ہے جنہیں تجربات اور تجزیے سے تقویت نہیں ملتی۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی بچے جسمانی خصوصیات کی طرح نفسیاتی خصوصیات وراثت میں نہیں پاتے۔

جب ہم انسان کی فطرت کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہم اس کا تصور مخصوص حالات (In A Situation) میں کرتے ہیں۔ یہ مخصوص حالات حیاتیاتی، اقتصادی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور کئی اور عوامل سے مل کر بنتے ہیں۔ اگرچہ ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کے لیے وہ حالات مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ سب کسی نہ کسی حالات میں زندگی گزارتے ہیں اور یہی ان میں قدرِ مشترک ہے۔ ہر انسان اور ہر انسانی گروہ اپنے مخصوص حالات میں رہ کر مختلف راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرتا ہے اس طرح سب انسانوں میں فطرت کی بجائے حالات مشترک ہیں جن میں وہ پیدا ہوتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔

ان حالات اور تجربات میں --- پیدا ہونے کا تجربہ --- مرنے کا تجربہ --- زندہ رہنے کے لیے محنت کرنے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا تجربہ --- سبھی شامل ہیں، جن سے کسی کو مفر نہیں۔ اس طرح پیدائش

اور موت کے درمیان ہر انسان چند مخصوص حالات کا سامنا کرتا ہے اور اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہم ڈیمو کریٹ سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہودی انسان بھی باقی انسانوں کی طرح ان مخصوص حالات کا سامنا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ہمیں یہودی کے انسان ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ بتاتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ وہ باقی انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے، زندگی کے دکھ سکھ سہتا ہے، محبت اور نفرت کرتا ہے اور پھر باقی انسانوں کی طرح مر جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہمیں اس کے یہودی ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی اس لئے یہودی انسان کو جاننے کے لیے ہمیں ان مخصوص حالات کا بھی مطالعہ کرنا پڑے گا جن سے صرف یہودیوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ ہم اس مضمون میں فرانس میں رہائش پذیر یہودیوں کے حالات کو مثال کے طور پر پیش کریں گے۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں کرنا چاہیئے کہ یہودی ایک "نسل" کا حصہ ہیں لیکن یہ لفظ "نسل" وضاحت طلب ہے۔ بعض لوگ نسل سے مراد چند جسمانی، ذہنی اور اخلاقی خصوصیات لیتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس نسل کا ہر فرد ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے لیکن جب ہم نسل کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد وہ ثقافتی اور تہذیبی خصوصیات ہوں گی جو یہودیوں میں باقی انسانی گروہوں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس لئے شاید ہمیں لفظ نسل کی بجائے نسلیں کہنا چاہیئے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام سیمائٹ یہودی نہیں ہوتے اور روس کے یہودی، الجیریا کے یہودی اور دوسرے معاشروں کے یہودی مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔

وہ یہودی جو سیمائٹ ہیں خاص قسم کی جسمانی خصوصیات کے حامل ہوتے

ہیں اور انہیں لوگ دور سے پہچان لیتے ہیں لیکن بہت سے یہودی ایسی خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے اس لیے انہیں جسمانی طور پر پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔

اگر بفرضِ محال ہم یہ مان بھی لیں کہ یہودیوں میں جسمانی خصوصیات مشترک ہوتی ہیں تب بھی ہم یہ قبول نہیں کر سکتے کہ ان کے کردار بھی ایک جیسے ہوں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی جسمانی ساخت اور اس کے مزاج، کردار اور شخصیت کا کوئی بلاواسطہ رابطہ نہیں ہے اور ہر شخص ایک گروہ کا فرد ہو کر بھی اپنی جداگانہ شخصیت رکھتا ہے۔ جسمانی خصوصیات سے ذہنی اور اخلاقی قدروں کی طرف چھلانگ لگانا ایک خطرناک عمل ہے۔

بعض یہودی داڑھی رکھتے ہیں، بعض نہیں۔

بعض یہودی کالے کپڑے پہنتے ہیں، بعض نہیں۔

بعض یہودی عینک لگاتے ہیں، بعض نہیں۔

اگر یہ خارجی خصوصیات ہیں اور ان کی طرزِ زندگی کی عکاس ہیں لیکن ان سے کسی کی داخلی خصوصیات اور اخلاقی معیار کا اندازہ لگانا ایک احسن بات نہیں۔

اگر ہم یہودیوں کو ان کی جسمانی خصوصیات یا ظاہری لباس سے انہیں دوسرے گروہوں سے جدا نہیں کر سکتے تو کیا ہم ان کے مذہبی اعتقادات اور قومیت سے ان کی شناخت کر سکتے ہیں؟

اس مقام پر پہنچ کر یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

اگر ہم تاریخ کے اوراق الٹیں تو ہمیں ماضی بعید میں ایک قوم اور ایک مذہبی گروہ اسرائیل کے نام سے ملتا ہے لیکن وہ گروہ اڑھائی ہزار سالوں میں منتشر ہو گیا تھا کیونکہ انہیں بابلان، فارس اور روم کی حکومتوں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا اور اس طرح اس گروہ کے افراد دنیا کے مختلف کونوں میں جا بسے تھے۔ انکا مستقبل

وہی ہوا تھا جو ہمارے دور میں فلسطینیوں کا ہو رہا ہے۔

عیسائیت کے فروغ نے یہودیوں کو مزید تقسیم کر دیا تھا۔

اس طرح ان یہودیوں میں جو مشرقِ وسطیٰ میں رہ گئے تھے اور ان یہودیوں میں جو دنیا کے دوسرے کونوں میں بکھر گئے تھے، جو مذہبی رشتہ تھا وہ آہستہ آہستہ قومی رشتہ بنتا چلا گیا۔

آج کے یہودیوں کے مذہبی جذبوں میں وہ شدت نہیں رہی جو ان کے آباد اجداد میں موجود تھی۔ ایک یہودی سے جب پوچھا گیا کہ اس نے اپنے بیٹے کے ختنے کیوں کروائے تھے تو وہ کہنے لگا "اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے اور ویسے بھی وہ ایک اچھی چیز ہے" اور جب مزید پوچھا گیا کہ "تمہاری ماں اس سے کیوں خوش ہوتی ہے؟" تو اس نے جواب دیا "اپنے دوستوں اور ہمسایوں کو خوش کرنے کے لیے" اس قسم کے جوابات سے یہودیوں کی اپنے ماضی، اپنی روایات اور اپنی رسوم سے رشتہ جوڑے رکھنے کی ایک شدید خواہش یا ضرورت پوشیدہ نظر آتی ہے۔ اس طرح یہودیوں کی کئی عادتیں ایک قسم کی مذہبی علامتیں بن گئی ہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ بہت سے یہودی گروہوں میں مذہبی اعتقادات نے منطق، عیسائیت کی تبلیغ، غیر مذہبی یہودیوں اور دہریت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں لیکن بہت سے یہودی آج بھی اپنے تاریخی ماضی کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں جسے وہ طویل قربانیوں کا سلسلہ سمجھتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا دھاگا ہے جو دنیا بھر کے یہودیوں کو باندھے رکھتا ہے--- کیا وہ دھاگہ تاریخ کا ہے، مذہب کا ہے، یا زمین کا۔ اور اگر ایسا نہیں تو کیا وہ بندھن اس وجہ سے ہے کہ وہ دنیا کے جس کونے میں بھی جاتے ہیں لوگ انہیں یہودی کہتے اور سمجھتے ہیں اور انہیں باقی قومیں اپنے اندر، غم نہیں

ہونے دیتیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے تاریخی طور پر یہودیوں کو عیسیٰ کا قاتل قرار دیا تھا (حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں صلیب رومنوں کی سزا دینے کا آلہ تھی اور عیسیٰ کو رومنوں نے سیاسی بغاوت کے الزام میں قتل کیا تھا) اس طرح یہودی اس ہستی کے قاتل قرار دیے گئے جس کی باقی لوگ پرستش کرتے تھے۔

کسی قوم میں رہنا اور اس قوم کے خدا کا قاتل یا قاتل کا بیٹا قرار دیے جانا ایک عذاب نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ان کے خلاف نفرت کی شدت ایک حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ ایک توجیہہ موجودہ دور کے نفرت کے سیلاب کی پوری طرح وضاحت نہیں کرتی۔

یہودیوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا ایک اقتصادی پہلو بھی تھا، عیسائی حکومتوں نے یہودیوں کو نہ تو زمین اور جائیداد حاصل کرنے کی اور نہ ہی انہیں فوج میں جانے کی اجازت دی اس لئے وہ صرف کاروبار سے اپنی روزی کما سکتے تھے۔ اس طرح جب یہودی معاشی اور کاروباری طور پر کامیاب ہو گئے تو ان پر اس کا بھی الزام لگایا گیا۔ اول تو عیسائیوں نے یہودیوں کو اپنی قوم کا حصہ نہ بننے دیا اور جب ان کی جداگانہ شناخت بن گئی تو انہیں علیحدگی پسند اور مفرور قرار دیا گیا۔

اس پس منظر میں ہمیں عیسائیوں سے یہ سوال پوچھنے کی بجائے کہ "یہودی کیا ہیں؟" یہ سوال پوچھنا چاہیئے کہ "تم نے یہودیوں کو کیا بنا دیا ہے؟"

جہاں تک یہودیوں کی شناخت کا تعلق ہے ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہودی وہ شخص ہے جسے باقی لوگ یہودی سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر ہم ڈیموکریٹ سے متفق ہیں کہ اینٹی سیمائٹ اپنی انا کی

تسکین کے لیے یہودی کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ صرف چند لوگوں کے جنون کی پیداوار نہیں بلکہ صدیوں کے غیر منصفانہ نظام کا ماحصل ہے اور اگر ہم یہ سمجھیں کہ چند دانشوروں کے مضامین لکھنے سے وہ ختم ہو جائے گا تو وہ ہماری سادگی ہوگی، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم یہ یقین کر لیں کہ کتابیں لکھنے سے جنگیں ختم ہو جائیں گی۔

جب یہودیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے تو وہ خوش تو ہوتے ہیں لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں اینٹی سیمیٹک جذبات کی جڑیں کافی گہری ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ڈیموکریٹ بھی جو ان کی طرفداری کرتے ہیں اینٹی سیمیٹک سے نرمی سے پیش آتے ہیں۔ اس عمل کی کئی وجوہات ہیں۔

اول یہ کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں زندہ ہیں جہاں ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہے۔

دوئم یہ کہ جب ملکی یک جہتی خطرے میں ہو یا بین الاقوامی دباؤ بڑھ جائے تو ہم ملک کے اتحاد کے لیے اندرونی مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب یہودیوں کے خلاف نفرت کے جذبات اپنی معراج پر ہوتے ہیں۔ اینٹی سیمائٹ اپنی نفرت کی شدت میں کمی نہیں کرتا لیکن ڈیموکریٹ سے یہ لوگ یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اینٹی سیمائٹ کو زیادہ نہ اکسائے۔

یہودیوں کو احساس ہے کہ وہ ملکی یکجہتی کی بھینٹ چڑھتے رہے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد وہ یہودی جو جرمن نازیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے تھے اور فرانس چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، جب واپس آئے تو پورا ملک خوشی کا جشن منا رہا تھا لیکن اس جشن میں یہودیوں پر مظالم کا کسی نے ذکر نہ کیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی، نہ تو اور لوگ اس کا ذکر کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی

یہودی عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانا چاہتے تھے۔ بہت سے یہودی کہنے لگے ''ہم جتنے نظر انداز کیے جائیں اتنا ہی بہتر ہے'' ہم سب جانتے ہیں کہ اس جملے کے دل میں جتنی حسرت اور محرومی پوشیدہ ہے۔ یہودیوں کو اپنے ہی ملک میں ایک طویل عرصے تک اس قدر غصے اور نفرت کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ وہ اب نظر انداز ہونے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

یہودی ایک طویل عرصے سے ایسے حالات میں زندہ ہیں جہاں ان کے دشمن ان کے ساتھ شدت سے دشمنی کرتے ہیں لیکن ان کے خیر خواہوں میں محبت کی گرمی مفقود ہے۔

ڈیمو کریٹ انتہا پسندی کی مخالفت کرتا ہے اور درمیانہ روی اور صبر و تحمل کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو بھی برداشت کرتا ہے اس لیے یہودیوں کے حق اور مخالف لوگوں کے درمیان جنگ ایک جیسی نہیں ہے، اگر ڈیمو کریٹ یہودیوں کی حمایت میں شدت پیدا کریں تو ان میں بھی انتہا پسندی آ جائے گی ایسی ہی انتہا پسندی جس کی وہ مخالفت کرتے ہیں۔

ڈیمو کریٹ یہودیوں کی اس لیے حمایت کرتا ہے کیونکہ وہ انسان ہیں اور مظلوم ہیں اور چونکہ دنیا میں اور بھی مظلوم انسان ہیں اور وہ ان کی بھی حمایت کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی ہمدردیاں مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہیں جبکہ اینٹی سیمائٹ اپنی تمام تر قومیت ایک گروہ کے خلاف صرف کرتا ہے اور وہ گروہ یہودیوں کا ہے۔

فرانس میں یہودیوں کی اکثریت کا تعلق درمیانے درجے سے ہے اور وہ ایسے پیشوں میں ملوث ہیں جہاں رائے عامہ بہت اہمیت رکھتی ہے، اگر کوئی یہودی وکیل ہے تو لوگ اس کے پاس اسی وقت جائیں گے جب وہ اسے پسند کریں

گے اور اس پر اعتماد کریں گے۔ جب ایک شخص کا روزگار اس کی شہرت پر منحصر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کا انحصار دوسروں کی رائے پر ہے۔ ایسے شخص کے حالات اس کسان سے مختلف ہیں جو اپنے کھیتوں میں ہل چلاتا ہے اور فصل اگاتا ہے، اس کے روزگار کا تعلق رائے عامہ سے نہیں ہوتا۔

اسی لیے یہودی کی شہرت اس کے لیے مسائل کھڑے کرتی ہے۔ اگر وہ ایماندار ہے، مخلص ہے، محنتی ہے تو اس کی شہرت چاروں طرف پھیل جاتی ہے لیکن اس کی شہرت کے ساتھ ساتھ اس کا یہودی ہونا بھی مشتہر ہو جاتا ہے جس سے اسے کوئی مفر نہیں۔ اگر وہ ایماندار کاروباری ہے تو سب اسے ایماندار یہودی کہتے ہیں۔ ایماندار تو ہے ہی لیکن یہودی بھی ہے۔

جب لوگ اسے ایماندار کہتے ہیں تو اسے سمجھ آتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن جب وہ یہودی کہتے ہیں تو اسے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس کا مطلب کیا ہے کیونکہ مختلف لوگوں کے ذہنوں میں یہودیوں کا تصور مختلف ہے۔

یہودی انسانوں کی زندگی کا ایک المیہ یہ ہے کہ ایک دن لفظ ''یہودی'' ان کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور پھر کبھی نہیں جاتا۔ بعض بچوں کو سکول میں ہی یدز (YIDS) کہہ کر تنگ کیا اور مارا پیٹا جاتا ہے اور بعض لوگوں کو نوجوانی میں اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہودی لوگوں کو جس دن یہ شناخت دی جاتی ہے اس دن سے وہ مجبور کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے مختلف پائیں۔ یہ صورتِ حال عجیب پریشان خیالی پیدا کرتی ہے۔ یہودی جانتے ہیں کہ وہ باقی انسانوں کی طرح ہیں لیکن باقی انسان انہیں اپنی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اکثر یہودی ایک عجیب تضاد کا شکار نظر آتے ہیں معاشرے میں ان پر

لعن طعن کی جاتی ہے جبکہ اپنے گھروں میں ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے یہودی ہونے پر فخر کریں۔ وہ اپنے آپ کو ایک ناقابلِ تسخیر مسئلے کا شکار پاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کریں وہ ساری عمر اپنی یہودیت سے فرار حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ سارا معاشرہ انہیں انسان بننے کی بجائے یہودی بننے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔

نازیوں کے دور میں یہودیوں کو انسانی حقوق اور مراعات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ نہ تو گلیوں میں پھر سکتے تھے نہ ہی کوفی ہاؤسوں میں جا سکتے تھے۔ زندگی کے ہر موڑ پر انہیں اپنے یہودی ہونے کا احساس دلایا جاتا تھا اور ان پر غصے اور نفرت کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص ان سے خلوص اور ہمدردی سے پیش آتا تو انہیں احساس ہوتا کہ وہ ان پر رحم کھا رہا ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو "میں تنگ نظر نہیں ہوں میں انسانوں کو انسان سمجھتا ہوں، میں نسلی تعصب کا شکار نہیں ہوں۔"

یہودی اپنے دل میں اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح محسوس کرتے ہیں۔

وہ وہی زبان بولتے ہیں جو باقی لوگ بولتے ہیں۔

وہ وہی اخبار پڑھتے ہیں جو باقی لوگ پڑھتے ہیں۔

وہ باقی لوگوں کی طرح ووٹ دیتے ہیں۔

لیکن لوگ انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ یہودیوں کی طرح بولتے، پڑھتے اور ووٹ دیتے ہیں۔

لوگ یہودیوں کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جس میں انہیں اپنا آپ نظر نہیں آتا لیکن اگر لاکھوں لوگ انہیں ایک ہی نظر سے دیکھیں تو وہ کر بھی کیا سکتے ہیں سوائے ڈراؤنے خواب دیکھنے کے۔

ویسے تو ہر شخص اس المیے کا شکار رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ لوگ اسے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن یہودی کے لیے یہ المیہ دوہرا ہو جاتا ہے۔ اس پر "یہودی فطرت" مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس پر ایک ایسی شخصیت ٹھونس دی جاتی ہے جس سے وہ بالکل نا آشنا ہوتا ہے۔

یہودی کا بھی مسئلہ ہے کہ جب ملکی حالات ٹھیک ہوں اور زندگی کا کاروبار جس میں وہ بھی شریک ہوتا ہے، امن و سکون سے چل رہا ہو تو وہ کس سے احتجاج کرے، اگرچہ وہ جانتا ہے کہ چاہے وہ بازار ہو یا سکول، یونیورسٹی ہو یا سیاست، ہر جگہ اس سے باقی لوگوں سے مختلف سلوک کیا جاتا ہے۔ یہودی کوئی بھی ایسا ثبوت پیش کرنا چاہے جس سے ثابت ہو کہ وہ باقی لوگوں سے مختلف نہیں ہے لیکن معاشرے میں کوئی شخص اس ثبوت کو قبول نہیں کرتا اس کے خلوص کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس طرح یہودی ہر معاشرے میں اجنبی شخص رہتا ہے وہ معاشرے میں رہ کر بھی اس کا حصہ نہیں بن پاتا کیونکہ معاشرہ اسے قبول نہیں کرتا، وہ معاشرے کی تعمیر میں کسی دوسرے شہری سے کم نہیں ہوتا لیکن وہ اس کے پھل سے محروم رہتا ہے اور کوئی معاشرہ اپنی تعمیر میں یہودی کی خدمت کو کھلے دل سے قبول نہیں کرتا۔

یہودیوں کو عورتوں کی طرح ایک طویل عرصے تک معاشرے کی تعمیر میں حصہ لینے سے محروم رکھا گیا ہے لیکن انہیں جب بھی موقع ملا ہے انہیں نے معاشرے کی خدمت کی ہے اور معاشرے کے ارتقا میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے دور میں آئن سٹائن (Einstein) برگساں (Bergson) کاھل (Chagal) اور کافکا (Kafka) اس کی درخشاں مثالیں ہیں۔

اگرچہ یہودیوں نے تاریخی طور پر اہم کردار ادا کیا ہے لیکن تاریخ دان نے انکا ذکر کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس لیے یہودی آج بھی بے گھر محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ دنیا بھر کے یہودی آپس میں ایک روحانی رشتہ محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے دشمن کہتے ہیں "دیکھا تم نے ان میں نسل کے بندھن ہیں وہ دنیا میں جہاں بھی جاتے ہیں یکجا ہو جاتے ہیں۔" اس طرح یہودیوں کے دشمن ہر محاذ پر جیت جاتے ہیں اور یہودی ہار جاتے ہیں۔ یہودیوں پر ان کے ہم وطن بھی اعتبار نہیں کرتے۔

اگر جنگ چھڑ جائے تو باقی لوگ تو فوج میں چلے جاتے ہیں لیکن جب یہودی فوج میں جانا چاہیں تو انہیں جواز پیش کرنا پڑتا ہے اور ان کے فوج میں جانے کو سب لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

چونکہ یہودی کی زندگی دوسروں کی آرا پر منحصر ہے اس لیے اس کی زندگی میں کبھی استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ ہر موڑ پر معاشرے کے مزاج کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کی نفرت سے بچنے کے لیے دولت، عزت، طاقت جمع کرتا ہے لیکن ایسا کرنے سے اس کے معتوب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں وہ ہمیشہ خود کو مقہور و مجبور محسوس کرتا ہے، اس کی زندگی میں وہ سکون کبھی نہیں آتا جس سے اس کے ہم شہریوں کی زندگیاں مالامال ہوتی ہیں۔

زندگی کے اس المیے کا عکس ہمیں ایک یہودی ادیب کافکا کے ناول دی ٹرائل (The Trial) میں نظر آتا ہے۔ ناول کے ہیرو کی طرح یہودی پر ایک طویل مقدمہ چل رہا ہے وہ نہ تو اپنے منصفوں سے واقف ہے نہ ہی پوری طرح اپنے وکیلوں سے۔ اسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اس پر الزام کیا لگایا گیا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ وہ مجرم قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا ہر دفعہ ایک یا دو ہفتے ٹلتی رہتی ہے وہ

اس مہلت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے لیکن ہر کوشش سے وہ حالات کی دلدل میں اور زیادہ گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے۔ وہ پوری کارروائی اسے اندر ہی اندر کھاتی چلی جاتی ہے اور آخر میں جب وہ اپنا مقدمہ ہار جاتا ہے تو چند ناآشنا لوگ اسے کسی غیر آباد علاقے میں لے جا کر قتل کر دیتے ہیں۔

جب اینٹی سیمائٹ کہتے ہیں کہ ایک یہودی یہودیوں کی طرح کھاتا، پیتا پڑھتا اور مرتا ہے تو یہ درست ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو اور کیا کرے۔ اس کے کھانے، اس کی نیند اور موت میں کسی نے زہر گھول رکھا ہے۔ اس کے چاروں طرف خوف کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں، اس کے لیے ہر گھڑی آزمائش کی گھڑی بن جاتی ہے۔

ہر یہودی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسروں نے اس کے لیے زندگی کا راستہ متعین کر رکھا ہے اب اس کی مرضی ہے کہ وہ اس راستے پر خوشی سے چلے یا غم سے، بہادری سے چلے یا بزدلی سے۔ اسے ہر حال میں ایک یہودی کی طرح زندگی گزارنے سے مفر نہیں۔ باقی معاشرے کے لوگ پہلے تو یہودیوں کو ایک خاص طرزِ زندگی پر دھکیل دیتے ہیں اور پھر انہیں ان اقدامات کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں۔ اسے ہر قدم پر سوچنا پڑتا ہے "اگر سب یہودی یہی اقدامات اٹھائیں تو ان کا یہودیوں کی اجتماعی زندگی پر کیا اثر پڑے گا" اگرچہ بہت سے یہودی ایسے ناپسندیدہ حقائق اور تلخ حالات سے بھاگ جانا چاہتے ہیں لیکن اینٹی سیمائٹ انہیں بھاگنے بھی نہیں دیتے۔

اینٹی سیمائٹ لوگوں نے یہودیوں کے خلاف ایک خطرناک جال پھیلا رکھا ہے جس سے انہیں کوئی مفر نہیں، جب ہم اس جال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی چند خصوصیات نظر آتی ہیں۔

اینٹی سیمائٹ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہودی ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ کنجوس، باریک بین اور داخلیت پسند ہوتا ہے اور اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔۔۔۔ ایک ماہرِ نفسیات سٹیکل (Stekel) نے اپنی تحریروں میں Jewish complex کا ذکر کیا ہے جو اس کی نگاہ میں احساسِ کمتری کا مظہر ہے۔

یہودی کی شخصیت میں یہ کجی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنی ذات کو پوری طرح قبول نہیں کر پاتا اور اینٹی سیمائٹ لوگوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ جب وہ اپنے دشمنوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بہت سے یہودی جان بوجھ کر فراخدلی کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ وہ ان لوگوں کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہودی کنجوس اور بخیل ہوتے ہیں اس طرح ان کی فراخدلی میں بھی تعصب کے خلاف جنگ کا زہر گھلا ہوتا ہے۔

یہودی اپنے اندر یہودیت کی نشانیاں تلاش کرتا رہتا ہے تاکہ وہ انہیں قتل کر ڈالے۔ وہ انسان اور صرف انسان کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کے باقی لوگوں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ یہودی عیسائیوں کو اس لیے حسرت اور شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ ان میں زیادہ خوبیاں ہیں بلکہ اس لیے دیکھتا ہے کہ عیسائی عام انسانوں کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں اور ان کے سر پر تعصبات کے آسیب کا سایہ نہیں لہراتا رہتا۔ یہودی ایک عام شہری کی طرح زندگی کے ہر شعبہ اور کارروائی میں حصہ لینا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا، وہ جہاں جاتا ہے لوگ اسے یہودی کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔

یہودی اس ردِ عمل اور حقیقت سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے قبول نہیں کرتا لیکن آہستہ آہستہ اسے اس حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑتا

ہے۔

امریکہ میں یہودیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ دو اور تین نسلوں کے بعد بھی عام شہریوں کی طرح زندگی نہیں گزارتے اور باقی امریکیوں کے ساتھ گھل مل کر نہیں رہتے، ان پر علیحدگی پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے---- لیکن حقیقت بالکل الٹ ہے---- یہودیوں کو دو تین نسلوں کے بعد بھی معاشرے کا حصہ نہیں بننے دیا گیا اور انہیں دل سے قبول نہیں کیا گیا اس لیے وہ معاشرے کا حصہ نہ بن سکے۔

اس طرح یہودی عجب تضاد کا شکار ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کا حصہ بننے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا، وہ کبھی بھی گمنامی کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ ایک ایسا درد بھرا رشتہ ہے جو تمام یہودیوں کو آپس میں جوڑتا ہے لیکن یہ رشتہ کرب کا، مصیبت کا، دکھوں کا رشتہ ہے جو دو ہزار سالوں پر محیط ہے۔ یہ رشتہ عیسائیوں کی نفرت کا پیدا کردہ ہے۔ ہر یہودی میں صرف ایک خصوصیت باقی یہودیوں کی طرح ہے اور وہ یہ ہے کہ سب لوگ کہتے ہیں۔ "یہودی باقی لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔" اور ان کی ایک خاص "فطرت" ہے۔ لیکن یہ "فطرت" اتنی پراسرار ہے کہ اسے خود یہودی بھی نہیں پہچان سکتے۔ ایک یہودی ماں اپنے بیٹے کو یہ کہتے ہوئے سنی گئی تھی "بیٹا! فکر نہ کرو تم بالکل یہودی نہیں لگتے۔"

یہودی ہمیشہ فخر اور احساسِ ندامت کے درمیان معلق رہتا ہے کبھی وہ اپنی یہودیت قربان کر کے انسانیت بچاتا ہے اور کبھی انسانیت قربان کر کے یہودیت بچاتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ خود اینٹی سیمائٹ بن جاتا ہے اور دوسری صورت میں ایک ایذا پسند (Masochist)

اینٹی سیمائٹ ہمیں یہ بھی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہودی عقل کو تخریبی انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہم سپینوزا، کافکا، آئن سٹائن اور ہرگاسن اور کئی دیگر عظیم انسانوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں جن کے انسانیت پر بہت سے احسانات ہیں اور جنھوں نے انسانی معاشرے کے ارتقاء اور تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈیموکریٹ یہودی کو انسان سمجھتا ہے یہودی نہیں اور وہ اسے کالوں، چینیوں اور دیگر قوموں کی قطار میں لا کھڑا کرتا ہے اور انسانی حقوق کی بات کرتا ہے اگرچہ وہ ان کے مستقبل کی بہتری کی بات کر رہا ہوتا ہے، لیکن وہ ان کی شناخت کی تردید اور ان تاریخی عوامل کو نظر انداز بھی کر رہا ہوتا ہے، جن کے تحت چینی، کالے اور یہودی انسانیت کے ناطے یکساں ہونے کے باوجود جداگانہ اجتماعی شناخت کے حامل ہیں، چنانچہ یہودی اپنے دشمن اور دوست کے درمیان قربان ہوتا رہتا ہے اس کا دشمن اینٹی سیمائٹ اس کے یہودی ہونے کے خلاف ہے اور اس کی انسانیت کو قبول نہیں کرتا جبکہ اس کا دوست ڈیموکریٹ اس کی انسانیت کو قبول کرتا ہے لیکن اس کی یہودیت کو نہیں۔

بہت سے یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ اگر لوگوں نے مل جل کر سمجھ بوجھ اور عقل و دانش سے تبادلہ خیال کرنا شروع کیا تو مسائل پیدا ہو جائیں گے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ نفرت، غصے اور تعصب کی جڑیں جذبات اور نسلوں کی منفی تربیت کا ماحصل ہیں جنہیں بدلنا اتنا آسان کام نہیں۔

یہودیوں کے مستقبل کو جہاں اینٹی سیمائٹ کی نفرت نے زہر آلود کیا ہے وہیں اسے ڈیموکریٹ کے لبرل اندازِ فکر نے دشواریوں کا شکار کیا ہے۔

ہم میں سے کوئی بھی یہ آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ ہر یہودی انسان کو اختیار

ہے کہ وہ ان تمام مسائل کو چھوڑ کر ایک آزاد اور خود مختار انسان کی طرح زندگی گزارے لیکن یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم جیل خانے کے قیدیوں کے بارے میں کہیں کہ انہیں اختیار ہے کہ وہ قید و بند کی صعوبتوں کو چھوڑ کر آزاد زندگی گزاریں لیکن قیدی کو جیل سے بھاگ جانے میں اپنی زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے اور اس صورتِ حال سے جیلر نے جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی اس پر ذمہ داری میں کوئی کمی نہیں آتی۔

ہر یہودی یہ جانتا ہے کہ کیونکہ وہ یہودی ہے اور اسے ہزاروں سالوں کی تاریخ نے یہودی بنایا ہے، وہ باقی لوگوں کی طرح ایک آزاد انسان کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ اپنی ذات، اپنے ماحول، اپنی تاریخ سے بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن وہ کہاں بھاگے، زندگی اور لوگوں نے اس کا دائرہِ حیات تنگ کر رکھا ہے، وہ اپنی ذات کی تردید کرتا چلا جاتا ہے المیہ یہ ہے کہ بعض دفعہ وہ اپنی تذلیل میں فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ایک کمزور یہودی حالات سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ ایک صحتمند اور بہادر یہودی حالات کا مقابلہ کرتا ہے لیکن ایک یہودی کا صحتمند زندگی گزارنا جس قدر اس کی اپنی ذات پر منحصر ہوتا ہے اتنا ہی ان لوگوں اور ماحول پر منحصر ہے جن میں وہ زندگی گزارتا ہے۔

اگر ہم یہودیوں کو ہر ملک اور قوم میں اسی ملک اور قوم کا شہری بن کر زندہ رہنے دیتے اور ان کے حقوق اور مراعات کا احترام کرتے تو وہ یروشلم کا رخ نہ کرتے اور اپنے اپنے ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی گزارتے۔

جب یہودی یروشلم کا رخ کرتے ہیں تو اینٹی سیمائٹ کہتا ہے "دیکھا وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے اور علیحدہ ملک بنانا چاہتے ہیں" لیکن یہ نہیں سوچتا کہ

ان کے لیے ظلم اور تعصب کے اس عذاب سے اپنے اپنے ملک سے فرار کے علاوہ کوئی چارہ بھی کیا ہے۔

یروشلم کا رخ کرنا یہودیوں کو ایک دفعہ پھر دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ بعض یہودی ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور اپنا جداگانہ ملک بنانا چاہتے ہیں اور بعض یہودی اپنے اپنے ملک میں باعزت شہری بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور دونوں راستے معاشرتی اور سیاسی کانٹوں سے اٹے پڑے ہیں۔

بدقسمتی سے یہودی اپنا مستقبل بہتر بنانے کے لیے جو بھی قدم اٹھاتا ہے وہ اس کے لیے مزید مسائل لے کر آتا ہے۔

یہودیوں کے مسائل کا حل

اس طویل نفسیاتی، معاشرتی اور تاریخی تجزیے کا مقصد یہ بات ثابت کرنا تھا کہ یہودیوں کے مسائل کی بنیاد یہودیوں کی شخصیت یا فطرت نہیں بلکہ وہ ماحول اور حالات ہیں جو اینٹی سیمائٹ لوگوں اور ذہنوں نے ان کے ارد گرد پیدا کئے ہیں۔

آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مسائل کا حقیقی حل کیا ہے؟

کیا یہودیوں کو ہر قوم میں مدغم ہو جانا چاہیے؟

کیا یہودیوں کے مسائل ختم کرنے کے لیے ان کی شناخت ختم کرنا ضروری ہے؟

یہودیوں نے اس منزل کی طرف جتنے بھی قدم اٹھائے ہیں انہیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ انہیں کسی قوم یا ملک نے خوش آمدید نہیں کہا کسی نے انہیں انسانیت کے ناطے گلے نہیں لگایا۔

جب تک معاشرے میں یہودیوں کے خلاف تعصب کا زہر قائم رہے گا ان کا دوسرے انسانوں کے ساتھ دوستانہ ماحول میں زندہ رہنا ناممکن ہو گا۔

ہمیں یہودیوں کو دونوں سطحوں پر قبول کرنا ہو گا ہمیں انہیں انسان کے طور پر بھی اور ان کی یہودی شناخت کو بھی قبول کرنا ہو گا جیسے ہم دوسرے لوگوں کو صرف انسانیت کے ناطے ہی نہیں بلکہ کیتھولک، پروٹسٹنٹ، انگریز، جرمن، کالے، گورے سب شناختوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ یہی جمہوری اور انصاف پسند معاشرے اور انسان دوستی کا تقاضا ہے۔ اگر ہم ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچے تو اس منزل کے حصول کی جدوجہد میں ہی ہماری کامیابی اور ارتقا کا راز مضمر ہے۔ اس میں ہم سب کی انفرادی اور اجتماعی فلاح ہے۔ ہم ایک شخص یا

گروہ یا قوم کے خلاف تعصب کی فضا پیدا کر کے اجتماعی امن کا خواب شرمندہِ تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس منزل کے حصول کے لیے ہمیں تعلیمی، سماجی اور سیاسی سبھی راستوں کو اختیار کرنا ہو گا۔ ہم کسی ایسے سماجی یا سیاسی نظام کو قبول نہیں کر سکتے جس میں انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے درجے کا شہری قرار دیا جائے اور انہیں ان کے حقوق اور مراعات سے محروم رکھا جائے یا ان کے خلاف تعصب اور نفرت کی فضا قائم کی جائے۔

انسانی فلاح انسانوں کے دلوں کو جوڑنے میں ہے ان کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے میں نہیں۔ ہم انسانی ارتقاء کے اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں پر انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی شناخت پر فخر کر سکتا ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے تاریخی یا سماجی طور پر مختلف ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہئے کیونکہ انسانی معاشرے میں مختلف روایات اسے دلکش اور بامعنی بناتی ہیں۔ جیسے باغ میں مختلف رنگوں کے پھول اور قوسِ قزح کے مختلف رنگ ان کے حسن اور معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کا مسئلہ کیا واقعی یہودیوں کا ہے یا غیر یہودیوں کا جنھوں نے انہیں ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔

رچرڈ وائٹ نے ایک دفعہ امریکہ میں کالوں اور گوروں کے تعلقات کے بارے میں کہا تھا "امریکہ میں مسئلہ کالوں کا نہیں گوروں کا ہے۔" اسی طرح یہودیوں کا مسئلہ دراصل "ہمارا" مسئلہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا اور مثبت اور تعمیری انداز میں سوچنا ہو گا، ہمیں انفرادی، معاشی، تعلیمی، قانونی، سیاسی ہر سطح پر اس کا حل تلاش کرنا ہو گا۔ اگر یہ اقدامات ایک ملک میں

شروع ہوئے تو امید کی جا سکتی ہے کہ آہستہ ممالک کے عوام اور نمائندے بھی ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور ان کا حل تلاش کریں گے۔

ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ یہودیوں کے مستقبل اور فلاح و بہبود کے ساتھ ہم سب کا مستقبل اور فلاح و بہبود مربوط ہے۔ ان کی بقا میں ہماری بقا کا راز مضمر ہے۔ جب تک کسی قوم کے یہودی آزادی اور احترام کی زندگی نہیں گزاریں گے اس وقت تک اس قوم کے باقی لوگ بھی ان نعمتوں سے محروم رہیں گے اور اس معاشرے میں احترامِ آدمیت کی روایت تعمیر کی بجائے تخریب اور کامیابی کی بجائے تنزل کی طرف قدم بڑھائے گی۔

مندرجہ بالا مضمون ژاں پال سارتر کی کتاب (Anti Semite and the Jew) کی تلخیص اور ترجمہ ہے جو فرانس میں ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی

تیسرا باب

یہودیوں کا قتل

اسرائیل گوٹمین
چیلم شیٹزکر

یہودی پر مظالم بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچ گئے کہ ہٹلر اور نازیوں نے یورپ کے تمام یہودیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ہٹلر نے اس منصوبے کو آخری حل (Final Solution) کا نام دیا۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف ممالک کے یہودیوں کی فہرستیں تیار کی گئیں۔
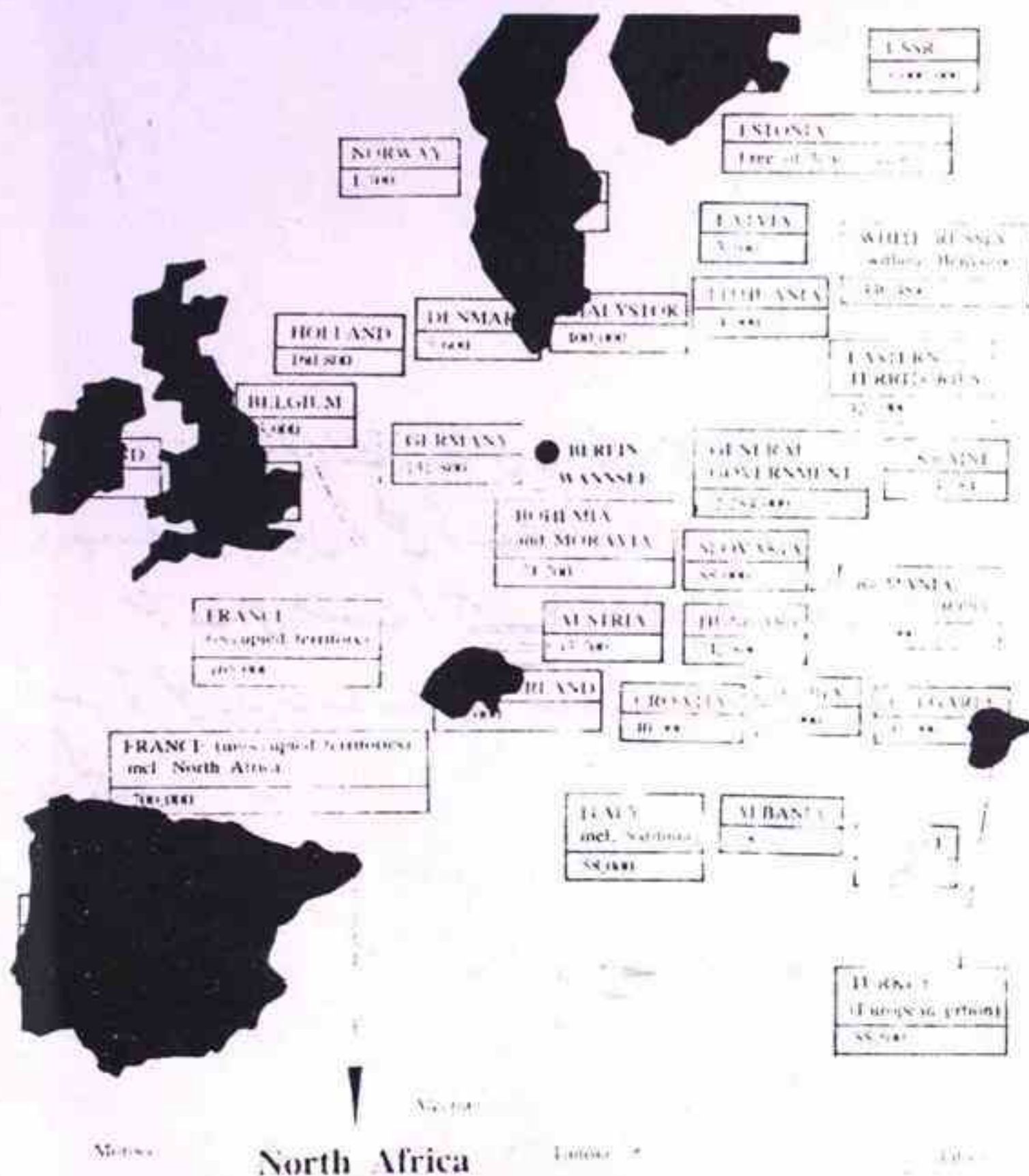
	Country	Number
A	Germany	131,800
	Austria	43,700
	Eastern Territories	420,000
	General-Government	2,284,000
	Bialystok	400,000
	Protectorate of Bohemia and Moravia	74,200
	Estonia	– free of Jews
	Latvia	3,500
	Lithuania	34,000
	Belgium	43,000
	Denmark	5,600
	France: Occupied territory	165,000
	France: Unoccupied territory	700,000
	Greece	69,600
	Holland	160,800
	Norway	1,300
B	Bulgaria	48,000
	England	330,000
	Finland	2,300
	Ireland	4,000
	Italy, including Sardinia	58,000
	Albania	200
	Croatia	40,000
	Portugal	3,000
	Rumania, including Bessarabia	342,000
	Sweden	8,000
	Switzerland	18,000
	Serbia	10,000
	Slovakia	88,000
	Spain	6,000
	Turkey (European portion)	55,500
	Hungary	742,800
	USSR	5,000,000
	Ukraine	2,994,684
	White Russia, without Bialystok	446,484
	Total:	over 11,000,000

Demographic Distribution of Jews, by Continents (1840-1946)

Continent	1840		1900	
	# Jews	%	# Jews	%
Europe	3,950,000	87.8	8,900,000	80.9
America	50,000	1.1	1,200,000	10.9
Asia (inc. Palestine)	300,000	6.7	510,000	4.6
Africa	198,000	4.4	375,000	3.4
Australia	2,000	0.0	15,000	0.2
Total	4,500,000		11,000,000	
Continent	**1939**		**1946**	
	# Jews	%	# Jews	%
Europe	9,500,000	56.8	2,850,000	25.9
America	5,540,000	33.1	6,000,000	54.6
Asia (inc. Palestine)	1,030,000	6.2	1,440,000	13.1
Africa	625,000	3.7	672,000	6.0
Australia	33,000	0.2	38,000	0.4
Total	16,728,000		11,000,000	

ایک اندازے کے مطابق نازیوں نے قریب چھ ملین
یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

Chalm Schatzker
اور
Yisiracl Gutman
کی کتاب
The Holocaust And It's Significance
سے چند اعداد و شمار

ہولو کوسٹ میوزیم (عکاسی : خالد سہیل)
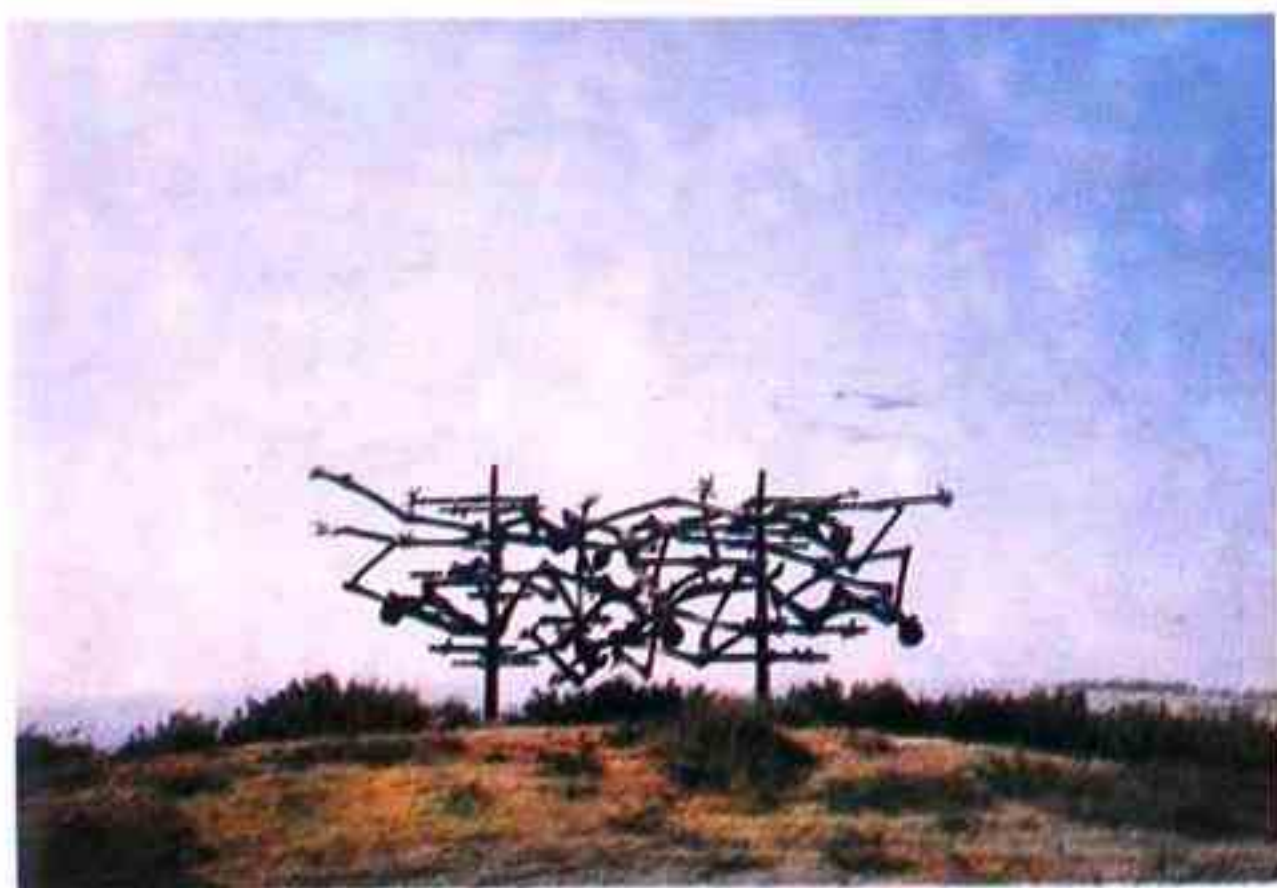
ہولو کوسٹ میوزیم (عکاسی : خالد سہیل)

چوتھا باب

یہودی ریاست اور تھیوڈور ہرزل

خالد سہیل

تھیوڈور ہرزل (Theodor herzl) وہ پہلا یہودی تھا جس نے یہودیوں کے بین الاقوامی مسائل کا حل پیش کیا تھا۔ یہودی ریاست (The Jewish State) عہدِ جدید کی وہ پہلی کتاب ہے جس میں وہ ہزار سالوں کے مجبور و مغفور و مظلوم یہودیوں کو کوئی امید دلائی گئی تھی۔

ھرزل نے صیہونی تحریک کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہودیوں کی جلاوطنی کو بین الاقوامی مسائل کے صفِ اول میں لاکھڑا کیا۔

ھرزل بدایست (Budapest) میں ۲ مئی ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تھا، اس کا خاندان کافی مذہبی تھا لیکن مذہب کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اس کی ماں اسے جرمن ادب بھی پڑھاتی رہتی۔ ھرزل کو خود بھی سکول کے زمانے سے ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کا خاندان ویئنا (Vienna) ہجرت کر گیا جہاں ہرزل نے یونیورسٹی میں قانون (Law) کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کی تعلیم کے دن ختم ہوئے اور وہ وکیل بن گیا۔ اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کے ماحول میں یہودیوں کے خلاف اتنا تعصب اور نفرت موجود تھا کہ وہ اپنے پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا چنانچہ اس نے وکالت کو خیر باد کہا اور ایک لکھاری (Writer) کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔

اس نے بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کا سفر کیا۔ مختلف ادیبوں سے ملا اور مختلف اخباروں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس دوران اس نے سٹیج کے لیے ڈرامے بھی لکھنے شروع کیے جو کافی کامیاب ہوئے۔ ۱۸۹۲ء تک پہنچتے پہنچتے ھرزل ادبی حلقوں میں ایک کامیاب جرنلسٹ اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ اسی سال اسے پیرس میں ایک اچھی ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلا گیا، اسی سال اس نے

ایک طویل رپورٹ لکھی جس کا عنوان تھا (French Anti-semitism) ھرزل نے ایک جگہ لکھا تھا "یہودی کا مسئلہ ایک قومی یا مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔"

اگلے چند سال ھرزل یہودیوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا، لوگوں سے تبادلہِ خیال کرتا رہا اور پھر اس نے اپنے خیالات اور نظریات کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا جسے دنیا کے سیاستدانوں اور سنجیدہ لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔

جوں جوں صیہونی تحریک زور پکڑتی گئی ھرزل کی بیماری بھی بڑھتی گئی، آخر جوانی میں ہی موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا، وہ ۳ جولائی ۱۹۰۴ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

تھیوڈور ہرزل کی قبر (عکاسی : خالد سہیل)

ھرزل کی کتاب کے چند اقتباسات

میں اس پمفلٹ میں یہودی ریاست کا جو تصور پیش کر رہا ہوں وہ تصور نیا نہیں ہے۔ لیکن ہمارے عہد میں یہودیوں پر جو مظالم کیے گئے ہیں ان سے مظلوم یہودی ایک دفعہ پھر بیدار ہو گئے ہیں۔ میں نے اس پمفلٹ میں یہودیوں کے بین الاقوامی مسائل کا ایک حقیقت پسندانہ حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں یہودی ریاست کے تصور کو ایک تحریک بنانا چاہتا ہوں اس تحریک میں یہودیوں کے دکھ اور درد ایسا جذبہ پیدا کریں گے جو اس تحریک کو منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ایک دن یہودیوں کے مسائل کا حل تلاش کر کے رہیں گے۔ چونکہ ایک یہودی ریاست پوری دنیا کے یہودیوں کے لیے ضرورت بن گئی ہے، اس لیے وہ قائم ہو کر رہے گی یہ وہ ریاست ہو گی جس میں یہودی آزادی، خوشی اور عزت کی زندگی گزار سکیں گے۔ اگر آج کی نسل نے میرے خیالات پر سنجیدگی سے غور نہ کیا تو مجھے امید ہے کہ کل کی نسل اس پر سنجیدگی سے غور کرے گی میری نگاہ میں ایک یہودی ریاست یہودیوں کا حق ہے۔

جب میں یہودیوں کے مسائل پر غور کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بہت سے یہودی اپنے دشمنوں کی طرح یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وہ جن ممالک میں رہ رہے ہیں وہ ان ممالک کی حکومتوں اور لوگوں کے رحم و کرم پر ہیں اور اگر انہوں نے انکا ساتھ نہ دیا اور خیال نہ رکھا تو وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ اس خیال سے واضح ہوتا ہے کہ ہم کس حد تک خود فریبی کا شکار ہیں اور اپنی طاقتوں سے کس قدر نا آشنا ہیں۔

ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لیے دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہئیے ہمیں اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرنا ہوگا۔ ہم صدیوں سے تعصب اور نفرت کا نشانہ بنائے گئے ہیں ہم جس نئے شہر یا ملک میں جاتے ہیں لوگ ہم سے تعصب کرنے لگتے ہیں۔ میرے نزدیک ہمیں اس مسئلے کا بین الاقوامی حل تلاش کرنا پڑے گا اور آزاد خیال اور مہذب قوموں سے تعاون کی درخواست کرنی پڑے گی۔

اگر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ظلم و تشدد، نفرت اور تعصب سے ہمیں کرۂ ارض سے نیست و نابود کر دیں گے تو یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ ہم صدیوں سے مصائب برداشت کرتے آئے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک ہم اپنے لیے ایک نئی ریاست نہ پالیں۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہودی دنیا میں جہاں جہاں آباد ہیں وہ مقامی لوگوں سے شادیاں کر کے ان میں مدغم ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا ہم آج بھی ایک علیحدہ قوم کی طرح اپنی شناخت رکھتے ہیں اور وہ لوگ اور قومیں جو اسے دبا دینا چاہتے ہیں اسے اتنا ہی مضبوط بناتے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اتنی ہی شدت سے دوبارہ ابھر کر آتی ہے، وہ شناخت جو دو ہزار سال سے نہ دبائی جاسکی آئندہ بھی نہ دبائی جاسکے گی۔ یہودی نہ پہلے کبھی دوسری قوموں میں مدغم ہوئے تھے اور نہ ہی آئندہ ہوں گے۔

یہودی ایک طویل مدت سے ایک خواب دیکھتے آئے ہیں جس کا اظہار ان کی گفتگو میں "اگلے سال یروشلم میں ملیں گے" سے ہوتا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں تاکہ ظلم کی یہ لمبی رات ختم ہو اور ہم سکون کی زندگی گزار سکیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ وہ یہودی جو اپنی انفرادی زندگی میں

کامیاب ہو گئے ہیں وہ اس تصور یا ریاست کے حق میں نہیں ہوں گے کیونکہ ان کا رشتہ یہودی قوم سے کافی حد تک کٹ چکا ہے لیکن یہ ریاست ان یہودیوں کے لیے دارالامان ہو گی جو آج بھی ذلت، رسوائی اور محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ریاست ان عام یہودیوں کو ذلت و خواری کی زندگی سے نجات دلائے گی اور ان کے لیے ایک عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرے گی۔

ہم اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک سوسائٹی قائم کریں گے جس کا نام (The Society of Jews) ہو گا۔ یہ تنظیم وہ نقشہ بنائے گی جس پر سفر کرتے ہوئے ہم اپنی منزل تک پہنچیں گے۔ یہ تنظیم ہر مرحلے کی ضروریات اور تقاضوں کا خیال رکھے گی اور ماہرین سے ان کی خدمات حاصل کرے گی۔

مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ بعض یہودی اپنی ناگفتہ بہ صورت حال کے اتنے عادی ہو گئے ہوں گے جیسے بعض قیدی قید میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد آزاد ہونا نہیں چاہتے ـــــ وہ یہودی ریاست میں نہیں جانا چاہیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ ان گھرانوں کے نوجوان ہماری تحریک میں پورے جوش و خروش سے شامل ہوں گے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔

یہ حقیقت ہم سب پر واضح ہے کہ آج کل یہودی دنیا کے جس شہر یا جس ملک میں بھی رہ رہے ہیں وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ فوج اور سیاسی کاروائیوں میں حصہ نہیں لے سکتے بلکہ روزمرہ کے کاروبار میں بھی ان سے بائیکاٹ کیا جاتا ہے، آپ کو دنیا کے ہر کونے میں اس قسم کے پوسٹر ملیں گے "Don't buy from Jews" یہودیوں سے تعصب اور نفرت کی وجوہات صرف انفرادی اور نفسیاتی ہی نہیں ہیں بلکہ معاشرتی، سیاسی اقتصادی اور اجتماعی بھی

ہیں۔ اور یہ مسئلہ صرف مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کا ایک معاشرتی مسئلہ ہے، اس رویے نے یہودیوں کی نفسیات اور معاشرتی زندگی کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ بہت سے یہودیوں میں اس تعصب اور ناانصافی کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں جو ان کی زندگیوں میں زہر گھولتے رہتے ہیں۔ بعض یہودی تو اپنی شناخت کھو کر دوسری قوموں میں مدغم بھی ہو جانا چاہتے ہیں تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا پائیں لیکن بد قسمتی سے وہ اس سے بھی کامیاب نہیں ہو پائے اور تاریخی، سیاسی اور معاشرتی عوامل نے انہیں اپنی شناخت کھونے نہیں دیا۔ اگر ہم نہ بھی چاہیں تب بھی ہمارے دشمنوں نے ہمیں ایک زنجیر میں باندھ رکھا ہے۔

میں نے یہودیوں کے بین الاقوامی مسائل کا جو حل سوچا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ اگر ہمیں کرۂ ارض پر اتنا علاقہ مل جائے جس میں ایک ریاست قائم کی جا سکے تو اس کے بعد ہم اپنے مسائل کا حل خود تلاش کر لیں گے۔

یہ حل بہت سادہ ہے اور اس حل کو عملی جامہ دو تنظیمیں پہنائیں گی۔

The Society of the Jews اس حل کے نظریاتی اور سیاسی حصے کا خیال رکھے گی اور The Jewish Company اس کے اقتصادی پہلو پر نظر رکھے گی تاکہ رخصت ہونے والے یہودیوں کی دولت اور کاروبار محفوظ رہیں اور نئی ریاست میں پہنچنے والے یہودیوں کو اقتصادی تحفظ مہیا کیا جا سکے۔

یہ تبدیلی بتدریج ہو گی اور یہ کوشش کی جائے گی کہ ہجرت کرنے والے افراد اور خاندانوں کو کم از کم مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔

میری یہ تمام یہودیوں سے درخواست ہے کہ ان میں سے جو بھی اس

ریاست کے حق میں ہیں وہ ہماری تنظیم میں شرکت کریں اور اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں ہماری مدد کریں۔

ہمیں دنیا کے کسی حصے میں ایک علاحدہ ریاست چاہیے، چاہے وہ فلسطین میں ہو یا ارجنٹینا میں۔ ہم ان دونوں مقامات میں سے کسی ایک کو قبول کر سکتے ہیں، ہم جہاں بھی جائیں گے محنت کریں گے اور اس علاقے کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے معیار کو بہتر بنائیں گے۔

مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس مسئلے کا حل ایک سال کا نہیں ہے اس میں کئی دہائیاں بھی لگ سکتی ہیں لیکن ایک دفعہ یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ دنیا بھر کے یہودیوں کو ایک گھر مل جائے گا۔ ایسا گھر جس سے وہ سینکڑوں سالوں سے محروم رہے ہیں، وہ ہر ملک میں بے گھری اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ دو ہزار سال میں کسی قوم یا کسی ملک نے انہیں سینے سے نہیں لگایا اور بے گھری ان کا مقدر بن چکی ہے۔

جب ہمیں ایک گھر مل جائے گا اور ہم ایک یہودی ریاست قائم کر لیں گے تو پھر ہمیں ان تمام مسائل کا حل اور ان تمام سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہوگا جو ایک نئی ریاست کو درپیش ہوتے ہیں۔ ان مسائل میں قومی زبان، جھنڈا، قوانین، فوج، کاروبار سبھی شامل ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ اگر ہم نے ان مسائل کے بارے میں ابھی سے سوچنا شروع کر دیا تو وقت آنے پر ہماری قوم کے نمائندے ان مسائل کا تسلی بخش حل تلاش کر لیں گے۔

میرا یہ یہودیوں کے مسائل کا حل کوئی پتھر پر لکیر نہیں ہے، یہ ایک تصور ہے ایک خواب ہے ایک خیال ہے اور مجھے امید ہے کہ باقی صاحبِ فکر اس پر غور کریں گے تاکہ ہم یہودیوں کے مسائل کا اجتماعی حل تلاش کر سکیں۔ مجھے یہ

یقین ہے کہ ہم ایک دن کرہ ارض پر ایک یہودی ریاست قائم کر کے ہی دم لیں گے چاہے وہ ارجنٹینا میں ہو یا فلسطین میں۔ اس ریاست کے قیام کے بغیر دنیا بھر کے یہودی آزادی، عزت اور خوشحالی کی زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہوں گے اس ریاست سے صرف یہودی ہی خوش نہ ہوں گے بلکہ ساری دنیا بھی ایک بہتر دنیا ہو گی۔

پانچواں باب

یہودی -- اسرائیلی شاعری کے تراجم

(Hebrew / Yiddish / English)

اور Hebrew کی کتاب T. Carmi)

Huward Schwartz اور Anthuny Rudule کی کتاب

Voices Within The ARC سے انتخاب)

خدا --- ایک فنکار

ایک انسان دیوار پر ایک تصویر بناتا ہے
پھر اس میں سرخ اور زرد رنگ بھرتا ہے
وہ رنگ وہیں رہتے ہیں جہاں اُس نے بھرے تھے
وہ تصویر دیوار سے نہیں ہلتی کیونکہ
اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں
وہ تصویر
نہ تو بات کر سکتی ہے
نہ دیکھ سکتی ہے
اور نہ ہی سن سکتی ہے
لیکن خدا ایک عجیب و غریب فنکار ہے
وہ ایک تصویر بناتا ہے
پھر اس میں کئی رنگ بھرتا ہے
پھر اس میں روح پھونکتا ہے
وہ تصویر حرکت بھی کرتی ہے، دیکھ بھی سکتی ہے، سن بھی سکتی ہے
اس طرح وہ ماں کے رحم کے اندر
ایک انسانی تصویر کو کامل کرتا ہے
ایک انسان ایک فنکار کے پاس جاتا ہے

اور کہتا ہے
میری خواہش ہے کہ تم میرے باپ کی تصویر بناؤ
فنکار کہتا ہے
میں تمہارے باپ سے کبھی نہیں ملا
اگر تم مجھے اس کا عکس لادو
تو میں اس کے مشابہ تصویر بنا سکتا ہوں
لیکن خدا ایک ایسا فنکار ہے
جو مرد کے منی کے نظریے سے
عورت کے رحم کے اندر
انسان کی تصویر بنانا شروع کرتا ہے
اس کی جلد بناتا ہے
پھر اس کا گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے
اس کا سراپا مکمل کرتا ہے
اور جب بچے کی تصویر بن جاتی ہے
تو وہ
ہو بہو اپنے باپ کی طرح ہوتی ہے

ایمتیائی شیپاتیا
نویں صدی عیسوی
ھیبرو

جنگ

جنگ
شروع میں
اس نوجوان دوشیزہ کی طرح ہے
جس سے سب کھیلنا چاہتے ہیں
لیکن آخر میں
اس بوڑھی طوائف کی طرح ہے
جس کے سب چاہنے والے آنسو بہاتے ہیں

سیموئل ہینو گر
(۹۹۲ء----۱۰۵٦ء)
عبرانی

مالک

تمہیں وہی شخص
اپنا نوکر بنانا چاہے گا
جو خود آرام پسند ہو
اور تمہیں
مشقت سے نڈھال کرنا چاہتا ہو
تم اس کے ہاتھوں میں
اس چمٹے کی طرح ہو گے
جسے وہ آگ میں توڑالنا چاہے گا
لیکن محتاط رہے گا
کہ اس کا اپنا ہاتھ نہ جل جائے

سیموئل ہینوگر
(۹۹۲ء--۱۰۵۶ء)
ہیبرو

سفر

ہر انسان
شب و روز موت کی طرف سفر کر رہا ہے
اگرچہ وہ بظاہر یہ محسوس کرتا ہے
کہ وہ ساکت ہے
وہ اس مسافر کی طرح ہے
جسے جہاز میں حرکت کا احساس نہ ہو
لیکن وہ جہاز
ہواؤں کے دوش پر پرواز کر رہا ہو

موسس ابن ازرا
(۱۰۵۵ء--۱۱۳۵ء)
حیبرو

عذر

وقت پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے
اس میں کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں
زندگی میں کام بہت سے ہیں
لیکن وقت کم
ہر انسان اپنے ہمسایے سے کہتا ہے
"گناہ سے دور رہو
اپنی خواہشات کو قابو میں رکھو"
لیکن جب وہ خود گناہ کرتا ہے
تو کہتا ہے
"انسان آخر کیا کر سکتا ہے
انسان تو معذور ہے
اس کی خواہشات کا اصل مختار تو اس کا خالق ہے"

جیوڈا ہلیوی
(۱۰۷۵--۱۱۴۱ء)
ھیبرو

ساقی

اے میرے دوست!
میرا جام مجھے دے دو
کیا تم نہیں دیکھتے کہ تاریکی جا رہی ہے
اور روشنی آ رہی ہے
سورج ایک جام کی طرح ہے
جو ایک دوست کے ہاتھ میں ہے
اس جام میں ایک مخصوص حدت ہے
یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
مشرق شراب انڈیل رہا ہو
اور مغرب اسے پی رہا ہے

گمنام شاعر
بارھویں صدی عیسوی
ہیبرو

سورج

دیکھو!

سورج نے اپنے پروں سے زمین کو ڈھانپ لیا ہے

تاکہ اسے تاریکی سے محفوظ رکھے

سورج

ایک عظیم درخت کی طرح ہے

جس کی جڑیں آسمانوں میں ہیں

اور اس کی شاخیں

زمین پر پھیل رہی ہیں

جیوڈاالریزی

(۱۱۷۰ء -- ۱۲۵۳ء)

ہیبرو

کاش میں ایک عورت ہوتا

(ایک عرب دوشیزہ کو دیکھ کر جو اپنی سہیلیوں سے
بوس و کنار کر رہی تھی)
میں نے محبت میں بہت مشقت کی
لیکن ناکام رہا
اپنی عرب محبوبہ کو نہ پا سکا
میری، اسے ہونٹوں پر بوسہ دینے کی خواہش
اتنی شدید ہے کہ
میری خواہش ہے کہ میں ایک عورت ہوتا
کیونکہ عورتیں اسے بوسے دے رہی ہیں
اور میں
چونکہ ایک مرد ہوں
اس لیے ناکام ہوں

ٹیڈروس ابولانیہ
(۱۲۴۷ء--۱۲۹۵ء)
ہیبرو

بوڑھا شاعر -- نوجوان عورت

جب مجھ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے
تو اس نے الوداع کہنے کا ارادہ کیا
کہنے لگی
"تم پر صبح کی سفیدی کے نشان نمایاں ہونے لگے ہیں
میں چاند کی طرح ہوں
اور صبح چاند کو بے رنگ کر دیتی ہے"
میں نے کہا
"نہیں نہیں
تم چاند نہیں
سورج کی طرح ہو
اور سورج دن کو نہیں چھپتا"
کہنے لگی

"اب تم اتنے طاقتور نہیں رہے
کہ محبت کا پیچھا کر سکو
اگر میں ٹھہر بھی گئی تو کیا فائدہ؟"
میں نے کہا
"میں ایک شیر کی طرح بہادر اور نڈر ہوں
میری ظاہری صورت کے علاوہ
مجھ میں کچھ نہیں بدلا"
کہنے لگی
"تم بے شک ایک شیر کی طرح ہو
لیکن میں ایک غزال ہوں
اسی لیے میں تمہارے پاس رہنے سے گھبراتی ہوں"

ٹیڈروس ابولانیہ
(۱۲۴۷ء -- ۱۲۹۵ء)
ہیبرو

بوڑھی طوائف کی آہ

اے ظالم وقت!
ایک وہ دور تھا جب
میرے دروازے پر
میرے خریداروں کی طویل قطار ہوا کرتی تھی
ایک یہ دور ہے کہ
میں گھر میں تنہا بیٹھی رہتی ہوں
ایک وہ دور تھا جب
میرے جسم کی
منہ بولی قیمت ملا کرتی تھی
ایک یہ دور ہے کہ
اسے کوئی مفت لینے کو بھی تیار نہیں

ایمونول فرانس
(۱۶۱۸ء---۱۷۱۰ء)
ھیبرو

بیوی کا کتبہ

میں نے
اپنی بیوی کی قبر پر
یہ بھاری پتھر
اس لیے نہیں رکھا کہ
مجھے اس سے بہت عقیدت ہے
بلکہ اس لیے رکھا ہے کہ
کہیں خدا نخواستہ
وہ قبر سے اٹھ کر
دوبارہ گھر نہ آجائے

ایمینول فرانس
(۱۶۱۸ء--۱۷۱۰ء)
حیبرو

ڈر و مت

ڈر و مت! میرے بچے
وہ صرف دو چوہے ہیں
جو میز سے کرسی پر چھلانگ لگا رہے ہیں
وہ بہت چھوٹے ہیں
وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائیں گے
ڈر و مت، میرے بچے
وہ بارش کے قطرے ہیں
جو کھڑکی کے شیشے پر
دستک دے رہے ہیں
ہم انہیں اندر نہ آنے دیں گے
میرے بچے
میرے اندر چھپ جاؤ
میں تمہاری ماں ہوں
ہم اپنے سروں پر تاریکی اوڑھ لیں گے
اور ہمیں کوئی نہ ڈھونڈ سکے گا

ڈیوڈ ووگل

(۱۸۹۱ء -- ۱۹۴۴ء)

ہیبرو

ایک مرد جس نے جوتوں سے باہر قدم رکھا تھا

میں وہاں کھڑا تھا
اور میں نے
اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا
نہ تو میں اس شخص کا نام جانتا تھا
اور نہ اس کے شجرۂ نسب سے واقف تھا
اس سنہری صبح کو
وہ بجلی کے کھمبے کے پاس گیا تھا
اور اپنے جوتے پیچھے چھوڑ کر
آگے نکل گیا تھا
ننگے پاؤں
وہ اپنی منزل سے آگے بڑھ گیا تھا
ایسے راستے پر

جس کی کوئی انتہا نہ تھی
ایسا راستہ
جس پر نہ کوئی گھر تھا نہ بستر
جہاں
نہ اسے روٹی کی ضرورت تھی نہ پانی کی
وہ خالی ہاتھ چل رہا تھا
میں نے اس کے چوڑے شانے
دراز قد
اور مردانہ قدم دیکھے تھے
میں نے ان پاؤں کو
اپنے جوتوں کی یادوں سے بے نیاز
انجانی منزلوں کی طرف جاتے دیکھا تھا
اور وہ جوتے
اس کا انتظار کر رہے تھے

اوری زوی گرین برگ

(۱۸۹۶ء)

ھیبرو

شہر کو الوداع کہنے والا

ایک صاحبِ ثروت انسان نے
دروازے بند کر کے
گھر کے تہہ خانے کا رخ کیا
شمع کی روشنی میں
اپنی دولت کو گنا
پھر اپنے دشمن گنے
پھر اپنے لوحِ دل سے
ایک نام کے علاوہ
سب نام مٹا دیے
پہلے اس نے شمع بجھائی
پھر اس کے پر لگ گئے
اور چونچ اگ آئی
اس نے کھڑکی کھولی
اور ایک پرندے کی طرح
شہر سے رخصت ہو گیا

نیتھن الٹرمین
(۱۹۱۰ء -- ۱۹۷۰ء)
ھیبرو

ہر شخص نام رکھتا ہے

ہر شخص نام رکھتا ہے
ایک نام جو اسے خدا نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے والدین نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے مرتبے نے دیا ہے
ایک نام جو اس کی مسکراہٹ نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے ہمسایوں نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے گناہوں نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے دشمنوں نے دیا ہے
ایک نام جو اس کے چاہنے والوں نے دیا ہے
ایک نام جو زندگی کے موسموں نے دیا ہے
ہر شخص نام رکھتا ہے
ایک نام جو اسے سمندر نے دیا ہے
ایک نام جو اسے موت نے دیا ہے

زیلڈا

(۱۹۱۴ء)

عبرانی

تاریکی میں

اگر وہ مجھے پتھر دکھائیں
اور میں کہوں کہ یہ پتھر ہے
تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پتھر ہے
اگر وہ مجھے درخت دکھائیں
اور میں کہوں کہ یہ درخت ہے
تو وہ کہتے ہیں کہ یہ درخت ہے
لیکن
اگر وہ مجھے خون دکھائیں
اور میں کہوں کہ یہ خون ہے
تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پینٹ ہے

عامر گلبوا

(۱۹۷۱ء)

دن سے رات تک

ہر صبح میں ایسے اٹھتا ہوں
جیسے آخری بار اٹھ رہا ہوں
نہ میں کسی کا منتظر ہوتا ہوں
اور نہ کوئی میرا منتظر ہوتا ہے
میرے لیے دن اور رات کی تمیز مٹ گئی ہے
صرف فرق اتنا ہے کہ
رات ذرا زیادہ سرد ہوتی ہے
اور صبح کے وقت
میں پرندوں کی چہچہاہٹ سنتا ہوں
اور مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے

جو شخص مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے
وہ یہاں نہیں ہے
میں دن سے رات میں
اس پرندے کے پر کی طرح گرتا ہوں
جو پرندے کی پرواز کے وقت
اس کے تن سے جدا ہو جاتا ہے
اور اسے خبر تک نہیں ہوتی

دالیا راویکووچ
(۱۹۳۶ء)
ہیبرو

جہاں میں رہا کرتا تھا

میں اپنے بیٹوں کو لے کر
اپنے عارضی گھر سے چلا
تا کہ انہیں
وہ جگہ دکھا سکوں
جہاں میں رہا کرتا تھا
جب ہم طویل سفر کے بعد وہاں پہنچے تو
میں نے کہا
"وہ دیکھو بیٹو
جہاں خاک اڑ رہی ہے
اور تھوڑی سی گھاس ہے
وہاں میں پتھر کا تکیہ بنا کر سویا کرتا تھا"

ہم ایک تکلیف دہ سفر طے کر کے
وہاں پہنچے تھے
راستے میں پہاڑ بھی آئے تھے اور وادیاں بھی
ایسے راستے بھی
جن میں جگہ جگہ پانی جمع ہو چکا تھا
ہماری گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی گزر رہی تھی
جب ہم پرانے گھر کے قریب پہنچے
تو میرے بیٹے پوچھنے لگے
"ابو! ہوا میں یہ بو کیسی ہے
ابو! دیواروں پر سے پلستر اتر کیوں گیا ہے"
اس گھر میں جو بوڑھی عورت رہتی تھی
کہنے لگی
"یہ وہ جگہ ہے
جہاں مستقبل بھی ماضی بن چکا ہے"
اور پھر اس نے زخمی پرندے کی طرح
اپنی آنکھیں اور کھڑکیاں بند کر لیں
میں نے بیٹوں سے کہا
"میں یہاں پیدا ہوا تھا

میرے باپ دادا بھی قریب ہی پیدا ہوئے تھے"
ہمارا ایک گھر ہوا کرتا تھا"
میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا کہ
ہوا میرے اور میرے الفاظ کے درمیان حائل ہو گئی
میں اپنے بیٹوں کو
وہ سب جگہیں دکھانا چاہتا تھا
جہاں میرا بچپن گزرا تھا
لیکن وہ کہنے لگے
"ابو! ہم کھانا کب کھائیں گے
ابو! ہم سوئیں گے کہاں؟"

ٹوویا ریوبنر

(۱۹۲۴ء)

عبرو

وہ شہر جہاں میں پیدا ہوا تھا

وہ شہر جہاں میں پیدا ہوا تھا
بموں سے تباہ کر دیا گیا تھا
وہ جہاز جس پر میں نے ہجرت کی تھی
جنگ کے دوران ڈوب گیا تھا
وہ کھیت جن میں میں کھیلا کرتا تھا
جلا کر راکھ کر دیے گئے تھے
وہ پل جس پر میں دریا پار کیا کرتا تھا
دشمنوں نے برباد کر دیا تھا
میری زندگی کا ہر نقش
مٹا دیا گیا ہے

میری یادیں کہاں تک میرا ساتھ دیں گی
میری بچپن کی محبوبہ قتل کر دی گئی ہے
میرا باپ مر گیا ہے
اس لیے تم اب
نہ تو مجھے اپنا محبوب بنانا نہ بیٹا
اور نہ ہی مجھے
اپنے شہر میں رہنے کی اجازت دینا

ایوز ٹرینن
(۱۹۲۸ء)
ھیبرو

۱۹۸۹ء میں یروشلم سے گزرتے ہوئے

کیا تم کبھی ایسے شہر میں رہے ہو

جسے حراست میں لے لیا گیا ہو

ہمارے تو اس شہر سے گزرتے ہوئے ہی

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

جب ہم

نوجوان مردوں سے

بندوق کی نوک پر

ان کی مردانگی چھنتے ہوئے دیکھتے ہیں تو

ہماری ریڑھ کی ہڈیوں میں

خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے

محاصرہ کرنے والے

اور محاصرہ ہونے والے
انسانوں کے درمیان
خوف کا ایسا رقص جاری ہے
جو ختم ہی نہیں ہوتا
ان میں سے ہر ایک
دوسرے کی بے معنویت سے
اپنی زندگی میں
معنی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے
اس شہر میں
بظاہر ہر چیز کی
کڑی نگرانی ہوتی ہے
لیکن در پردہ
نجانے کتنی باتیں ہیں
جن سے پردہ پوشی کی جاتی ہے

میں ان بچوں پر آنسو بہاتی ہوں
جن سے بے رحمانہ سلوک کیا گیا ہے
مجھے ڈر ہے کہ کہیں

میرے شوہر اور میرے بیٹے کو بھی
جنگ کی آگ کا ایندھن نہ بنا دیا جائے
میں جب انسانوں کو
احترامِ آدمیت کی حدود کو
نظر انداز کرتے دیکھتی ہوں
تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے
ہم طاقت کے نشے میں اس قدر مخمور ہیں
کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں سے کھیل رہے ہیں

میں جب
دونوں جانب کے دشمنوں کو
ایک دوسرے کو
انسانیت کی کمترین حدود کو
چھونے پر مجبور کرتا دیکھتی ہوں
تو مجھے متلی ہونے لگتی ہے

ایوا کاٹز
(۱۹۴۲ء)
انگریزی

بکھرے ہوئے یہودی

جب ڈروز آپس میں ملتے ہیں تو
وہ گانے گاتے ہیں
جب خانہ بدوش آپس میں ملتے ہیں تو
وہ رقص کرتے ہیں
جب انگریز آپس میں ملتے ہیں تو
وہ خاموش رہتے ہیں
جب فرانسیسی آپس میں ملتے ہیں تو
وہ قہقہے لگاتے ہیں
اور جب یہودی آپس میں ملتے ہیں تو
وہ کیا کرتے ہیں؟
افسوس کی بات یہ ہے کہ
وہ آہیں بھرتے ہیں

ریشم بوٹم وال
(۱۹۱۳ء)
یدش

رات کے وقت

رات کے وقت
بند دروازے کے باوجود
میرا شہید باپ
دیوار سے گھر میں داخل ہوتا ہے
اور میری آنکھوں میں جھانکتا ہے
اور پھر میرا دادا
جو خود بھی شہید ہو چکا ہے
داخل ہوتا ہے
اور میرے باپ کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے
اور پھر
تھوڑی دیر کے بعد

میری دادی داخل ہوتی ہے
جس کا جسم زخموں سے بھرا ہوتا ہے
اس کے بعد
میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے
کیونکہ میں سوچنے لگتا ہوں کہ
ایک فطری موت کی بجائے
کسی گولی سے
قتل ہو جانا کیسا ہوتا ہو گا
اور پھر
وہ تینوں سر
اور تین آنکھوں کے جوڑے
اسی دیوار میں غائب ہو جاتے ہیں
جس دیوار سے وہ داخل ہوئے تھے
اور تاریکی انہیں
اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے

ریشم بونم وال
(۱۹۱۳ء)
یدش

روشنی کا شہر

آؤ ہم
اس روشنی کے شہر کو چھوڑ دیں
اس تیز روشنی نے
مجھے اندھا کر دیا ہے
آؤ
اپنے پیلے ہاتھوں سے
میرا ہاتھ تھامو
میری رہنمائی کرو
اور مجھے
روشنی کے تاریک حصے میں لے جاؤ

ناحم بومزے
(۱۹۰۶ء -- ۱۹۵۴ء)
یدش

نووارد

ہم سب
ایک اجنبی جہاز میں
سفر کر کے
اس ساحل تک پہنچے ہیں
ایک اجنبی کپتان نے
ہمیں سمندر کا سفر کروایا ہے
وہ جہاز
سارا راستہ
ہچکولے کھاتا رہا ہے
اتنے ہچکولے کہ
آرام کی نیند سونا مشکل تھا
ہم
ایک نئے ساحل پر
پہنچ تو گئے ہیں لیکن
ہم میں سے
کتنے ایسے ہیں جو

اپنی بیویوں
اپنے بچوں
اور
اپنے ماں باپ کو
پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ہمارے دل زخمی ہیں
جب ہم ساحل پر پہنچے تو
ایک اجنبی نے ہمارا
سر سے پاؤں تک معائنہ کیا
ہماری آنکھوں
ہمارے چہروں
کو ایسے دیکھا جیسے
کوئی کسی جانور کا معائنہ کرتا ہے
وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ
ہم صحتمند ہیں
اگر وہ ہمارے دلوں میں جھانکتا تو
اسے زخم نظر آتے
ہم نے رخصت ہوتے وقت

ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا
لیکن وہ الوداع
گونگی اور بہری تھی
اور اگر
کئی سالوں کے بعد
ہم ایک دوسرے سے ملیں گے تو
ہمیں احساس ہوگا کہ
ہم اس شہر کے باسی ہیں
جہاں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں
لیکن وہ سب
ہمارے لیے اجنبی ہیں
اور ہم وہاں
گونگوں اور بہروں کی طرح
زندگی گزار رہے ہیں

ابراہم رائزن
(۱۸۷۶ء -- ۱۹۵۳ء)
یدش

ہوا کہاں آرام کرتی ہے

ہوا کہاں آرام کرتی ہے
جب وہ آندھی بن کر نہیں چل رہی ہوتی
مسافر کہاں آرام کرتا ہے
جب وہ سفر نہیں کر رہا ہوتا

اے میری روح
تم کہاں آرام کرو گی؟
جب میں
اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گا

شمسی گروسی

(۱۸۹۵ء --- ۱۹۵۸ء)

پیدش

بے مقصد گھومنا

میں ایک سال سے
دو سالوں سے
تین سالوں سے
نجانے کتنے سالوں سے
بے مقصد گھوم رہا ہوں
میں ہر جگہ
بن بلایا مہمان بن کر
پہنچ جاتا ہوں
لیکن ہر جگہ
خاموشی
اور
بوریت
اور
تنہائی
میرے منتظر ہوتے ہیں

موئش کلبیک
(۱۸۹۶ء-- ۱۹۴۰ء)
یدش

میرے بعد باقی کیا رہ جائے گا

میرے بعد باقی کیا رہ جائے گا
ایک ادھ کھلا دروازہ
پرانی اور گرد سے اٹی
کتابوں سے بھری الماری
ایک خالی کرسی
جس میں بیٹھ کر میں نظمیں سوچا کرتا تھا
ایسی نظمیں
جو میرے جذبات اور خیالات کی عکاسی کرتی تھیں
ایسی نظمیں
جو میز کی دراز میں
گونگی رہ جائیں گی
ان خطوں کی طرح
جو نامکمل رہ گئے تھے

میرے بعد باقی کیا رہ جائے گا
جوتے اور موزے
ایک قمیص
جو میرے دکھی دل کو چھپا کر رکھتی تھی
میرے بعد باقی کیا رہ جائے گا
ایک سورج کی کرن
جو شام کے وقت
صحن کی دیوار پر بکھر جائے گی ۔

ہینڈل نیگریشل
(۱۹۰۳ء -- ۱۹۶۵ء)
یدش

میں جنگل سے محبت کرتا ہوں

میں جنگل سے محبت کرتا ہوں
اس جنگل سے
جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے
اور آسمان سے جا ملتا ہے
نہیں میں جنگل سے محبت نہیں کرتا
میں اس پگڈنڈی کو چاہتا ہوں
جو اس جنگل میں چھپ چھپ کر
دور تک چلی جاتی ہے
میں اس پگڈنڈی کو چاہتا ہوں
جس کے دونوں طرف ایسے پھول اگے ہوئے ہیں
جسے لوگ جنگلی گھاس کہتے ہیں
نہیں میں پگڈنڈی کو نہیں چاہتا
میں اس گھر کو پسند کرتا ہوں

جہاں یہ پگڈنڈی جا کر ختم ہوتی ہے
میں اس گھر کو پسند کرتا ہوں
جس کے چاروں طرف خوبصورت باغ ہے
نہیں میں اس گھر کو پسند نہیں کرتا
میں اس دوشیزہ سے محبت کرتا ہوں
جو اس گھر میں
آرام اور سکون کی زندگی گزارتی ہے

لیب نائڈس

(۱۸۹۰ء -- ۱۹۱۸ء)

یدش

آٹھ کا خاندان

صرف دو بستر
اور آٹھ کا خاندان
جب شام کے سائے گہرے ہوتے ہیں
تو وہ کہاں سوتے ہیں؟
تین بچے باپ کے ساتھ
تین بچے ماں کے ساتھ
چھوٹے چھوٹے پاؤں
چھوٹی چھوٹی انگلیاں
ایک دوسرے میں مکمل مل جاتے ہیں
جب رات بھیگتی ہے
تو ماں سوچتی ہے

کاش وہ مر گئی ہوتی
لیکن
قبر بھی تو تنگ ہوتی ہے
فرق یہ ہے کہ اس میں
انسان، اکیلا ہوتا ہے

ابراہم رائزن
(۱۸۷۶ء--۱۹۵۳ء)
یدش

میں امیر نہیں ہوں

میں امیر نہیں ہوں
میرے گھر میں
صرف ایک ہی کوٹ ہے
میں وہی کوٹ پہن کر
بازار بھی جاتا ہوں
اور عبادت کرنے بھی
اسی کوٹ پر
گرمیوں میں گرد بھی پڑتی ہے
اور برسات میں بارش بھی
اس پر
کیچڑ کے اتنے داغ پڑتے ہیں
جنہیں کوئی صابن نہیں دھو سکتی
میں یہی کوٹ

دعوتوں میں بھی پہنتا ہوں
اور جنازوں میں بھی
میں امیر نہیں ہوں
میں اسی داغ دھبوں سے بھرے
کوٹ میں
ایک دن
جنت الفردوس میں بھی داخل ہوں گا

جوزف رولنک
(۱۸۷۹ء -- ۱۹۵۵ء)
یدش

آؤ مل کر ہنسیں

آؤ
تم اور میں
مل کر ہنسیں
ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دو عاشقوں کی طرح
تم
اپنی ہزار آنکھوں سے
اور میں
اپنی تھکی ہوئی دو آنکھوں سے
اور ایک دوسرے کو
اس وقت تک دیکھتے رہیں
جب تک کہ
ہمارا غم تحلیل نہ ہو جائے
اور ہم دونوں بھی
تحلیل نہ ہو جائیں

زوی شار گل
(۱۹۰۵ء) یدش

میں کہتا ہوں

میں خدا سے کہتا ہوں
اے خدا!
میں ایک بے گھر مسافر ہوں
اگر میرا دل پاک صاف ہوتا
تو میں تمہیں
اس میں ایک رات
گزارنے کی دعوت دیتا

ملکا ٹوسمین
(۱۸۹۶ء)
یدش

میری ماں کے جوتے

رات کے وقت
میرے جوتے میری طرف دیکھتے ہیں
میری ماں کی تھکی آنکھوں سے
وہ آنکھیں جنھوں نے
ہمیں سفر کرتے لیکن منزل پر نہ پہنچتے
قسمت کو تلاش کرتے لیکن نہ پاتے دیکھا تھا

میں سارا دن
اونچی عمارتوں
اور نشیبی وادیوں
کے شہر میں
گزارتا ہوں
لیکن جب رات کو
اپنی ماں کے جوتوں میں گھر لوٹتا ہوں
تو ان جوتوں پر
برسوں کی گرد جمی ہوتی ہے

ریزل زائی چلنسکا
(۱۹۱۰ء) یدش

سڑک پر کھڑا درخت

سڑک پر ایک درخت
کمر جھکائے کھڑا ہے
اس کی شاخوں سے سب پرندے
نجانے کب کے جا چکے ہیں
تین مشرق کی طرف
تین مغرب کی طرف
اور
تین جنوب کی طرف
طوفان کی خبر سن کر
اڑ گئے ہیں
اور درخت تنہا رہ گیا ہے

میں نے اپنی والدہ سے کہا
اماں!
مجھے تنگ نہ کرنا
اب میں پرندہ بننے والا ہوں
تاکہ
اس درخت پر بیٹھ سکوں
اور ساری سردیاں
اس کی نگہداشت کر سکوں
جب برفباری ہوگی تو
اس کو تسلیاں دوں گا
اور
اس کے لیے محبت بھرے گانے گاؤں گا
میری والدہ نے کہا
"میرے بچے!"
اور پھر وہ رونے لگیں
"تمہیں وہاں سردی لگ جائے گی
اور تم مر جاؤ گے"
میں نے کہا

''اماں! تم فکر نہ کرو
میں آسمانوں میں پرواز کرنا چاہتا ہوں''
میری والدہ نے کہا
''میرے لاڈلے!
میں منت کرتی ہوں
تم کم از کم ایک شال اوڑھ لو
تاکہ سردی میں ٹھٹھر نہ جاؤ
تم ایک اونی ٹوپی
اور
ایک اوور کوٹ بھی لے جاؤ
میں نہیں چاہتی کہ تم
وقت سے پہلے ہی مر جاؤ
میں نے جب اڑنے کی کوشش کی تو
نہ اڑ سکا
میرے پروں پر
میری والدہ کے کپڑوں کا بھاری بوجھ تھا
میں نے اپنی والدہ کے
افسردہ چہرے کی طرف

آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا
اور سوچا کہ
میری ماں کی محبت نے
میرے ایک خواب کو
شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیا
مجھے آسمانوں کی فضاؤں میں
اڑنے نہیں دیا

اٹزک مینگر
(۱۹۰۱ء -- ۱۹۲۹ء)
یدش

ایک شاعر کی یاد میں

آج رات
مجھے چاند نے جگا دیا
اس چاند نے جو
آسمان کے دشت میں تنہا
چہل قدمی کر رہا تھا
اس شاعر کی طرح
جو مرنے کے بعد بھی
اپنی سبز ثانی لگائے
ہاتھوں میں اپنا دیوان اٹھائے
کیفے میں سیر کے لیے جاتا ہے

دوستوں کو اپنی نظم سناتا ہے

ان سے مشورہ چاہتا ہے

ان سے جھگڑتا ہے

اور نظم مٹا دیتا ہے

میں اب بھی خالی میزوں میں

اس شاعر کو تلاش کرتا رہتا ہوں

ریزل رانی چیلنکا

(۱۹۱۰ء)

پیدائش

ایک خط

اے میری محبوبہ!

آج ایک خوبصورت دن ہے

چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ہے

میں اس دوپہر کو

بڑی محبت سے لپیٹ کر

اور

اپنے خوابوں کے دھاگے سے باندھ کر

تمہیں

ایک خط میں بھیجنا چاہتا ہوں

لیکن میں جانتا ہوں

کہ تم وہ "خط"

کونے میں ایک نوٹ لکھ کر

غصے میں

واپس بھیج دو گی

کیونکہ تم میری بات سمجھ نہ پاؤ گی

(تم میری بات کبھی بھی سمجھ نہیں پاتیں)

اور کہو گی کہ

وہ خط خالی تھا

ریشل کورن

۱۸۹۸ء

یدش

ایک نیا لباس

آج

سات سال کے بعد

میں نے ایک نیا لباس پہنا ہے

لیکن یہ لباس

میرے درد کے لیے چھوٹا ہے

میرے غم کے لیے تنگ ہے

اور

اس کا ہر سفید شیشے کی طرح بٹن

اس آنسو کی طرح ہے

جو

پتھر بن کر

اس لباس کی سلوٹوں میں

بہہ جاتا ہے

ریشل کورن

۱۸۹۸ء

یدش

قربانی

خوف کی کڑیاں
وہ زنجیریں بن جاتی ہیں
جو میرے ہاتھوں اور پاؤں کو جکڑ لیتی ہیں

میرا باپ
مجھے کبھی قربان گاہ کی طرف
نہیں لے جانا چاہتا تھا
لیکن وہ بھی
میری طرح مجبور تھا

اب میں قربان گاہ میں پڑا ہوں
میرا باپ میرے اندر موجود ہے
میرا دادا بھی میرے اندر موجود ہے
اب اس سے کوئی فرار نہیں
کوئی فرار نہیں

موشے ینگ مین
(۱۹۲۲ء)
یدش

شناخت

دیوارِ گریہ
مختلف الفاظ اور ناموں سے بھری پڑی ہے
ایسے نام
جنہیں میں نہیں پڑھ سکتا
ان ناموں میں
میں اپنا نام تلاش کرتا ہوں
میں ایسے علاقے میں آ گیا ہوں
جہاں پرندے بھی یہودی ہیں
اور جہاں کی بلیاں بھی
مقدس زبان میں میاؤں میاؤں کرتی ہیں
ایسی زبان
جو پراسرار ہے

اور جس کے ہر لفظ سے
گرماہٹ ٹپکتی ہے
لیکن میں
جس کا نام رابرٹ ہے
انگریزی زبان بولتا ہوں
ایسی زبان
جس کے ہر لفظ سے
خنکی پھوٹتی ہے
لیکن میں
اس زبان سے محبت کرتا ہوں

رابرٹ فرینڈ
(۱۹۱۳ء)
انگریزی

مجھے مت دکھاؤ

مت دکھاؤ

مجھے اور تصویریں مت دکھاؤ

میں نہیں جاننا چاہتا

ان بچوں کے بارے میں

جنہیں گھوڑا گاڑیوں میں لے جایا گیا

ان مردوں کے بارے میں

جنہیں بیل گاڑیوں میں لادا گیا

ان عورتوں کے بارے میں

جنہیں ملک بدر کر دیا گیا

اور ہزاروں لوگوں نے انہیں

آہیں بھرتے ہوئے الوداع کہا

ایسی آہیں

جنہیں سن کر زمین کا سینہ شق ہو گیا
مجھے تصویریں مت دکھاؤ
مجھے یہ باور کرنے دو کہ
میری قوم کے مرد
شہرِ آزادی کے بادشاہ تھے
عورتیں ملکائیں تھیں
اور بچے
وہ شہزادے تھے
جو گھڑ سواری کرتے تھے
یہ تصویریں پھینک دو
میں انہیں نہیں دیکھنا چاہتا
میں نہیں جاننا چاہتا کہ
میرے آباء واجداد قتل کر دیے گئے تھے
میرے والدین غلام بنا لیے گئے تھے
میں اپنے آپ کو
یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ
وہ کسی اور قبیلے کے واقعات ہیں
وہ کسی اور عہد کے قصے ہیں

ان تصویروں کو لے جاؤ
انہیں میرے گھر میں مت رکھو
میں اپنے بچوں کو
کیسے بتاؤں گا کہ
ہمارے خاندان سے
کوڑے کرکٹ سے بھی بدتر سلوک کیا گیا تھا
آج کل کوڑا اٹھانے والے بھی
دستانے پہنتے ہیں
نجانے کس نے
ان تمام واقعات کی تصویریں اتاری تھیں
مجھے وہ تصویریں مت دکھاؤ
مت دکھاؤ

روتھ بیکر
(۱۹۴۰ء)
انگریزی

چھٹا باب

(نثری نظم)

خالد سہیل

اپریل ۱۹۹۲ء

بے گھروں کا شہر

ہر آنکھ میں غم کا آنسو
ہر چہرے پر خوف کی زردی
ہر ذہن میں ماتمی نوحہ
ہر دل میں امن کی امید
چاہے وہ اسرائیلی عورت ہو یا عرب مرد
چاہے وہ عیسائی بچہ ہو، مسلمان نوجوان یا یہودی بوڑھا
ہر گھر میں بے گھری کے چراغ
ہر دیوار پر آسیب کے سائے
ہر کھڑکی پر خوف کی سلاخیں
ہر گلی میں خون کے چھینٹے
ہر بازار میں دہشت کی پرچھائیاں
ہر چوراہے پر انصاف مصلوب
ہر عبادت گاہ میں حق سنگسار
ہر سکول میں جہالت رقص کناں
ہر ایوانِ سیاست میں تعصب خندہ زن
اس شہر کا ہر شہری

مظلوم و مقہور و مجبور
چاہے وہ اسرائیلی عورت ہو یا عرب مرد
چاہے وہ عیسائی بچہ ہو، مسلمان نوجوان یا یہودی بوڑھا

ہمیں ایک مسلمان عرب ملا
کہنے لگا
"میرا نام محمود ہے
میرا دادا فلسطین میں پیدا ہوا تھا
میرے باپ نے فلسطین میں عمر گزاری
لیکن پھر وہ فلسطین اسرائیل بن گیا
اسی لیے میرے پاس اسرائیلی پاسپورٹ ہے
میں جانتا ہوں کہ اب
کرۂ ارض پر کوئی فلسطین نہیں
وہ صرف ہمارے خوابوں میں ہے
جب سے حکومت
یہودیوں کے قبضے میں آئی ہے
ہم خوف کی فضا میں سانس لیتے ہیں
جب عراق سے جنگ ہوئی اور

صدام نے سکڈ میزائل پھینکے تو
فلسطینیوں نے چھتوں پر چڑھ کر مرحبا کہا
لیکن
یہودی زمین دوز سرنگوں میں جا چھپے
اور جب جنگ ختم ہوئی تو
ان چھتوں اور ان گھروں کو مسمار کر دیا گیا
جن پر چڑھ کر
فلسطینوں نے عراق کی حمایت میں نعرے لگائے تھے
ہم اپنے ملک میں محصور ہیں
ہم اپنے شہر میں مجبور ہیں
ہمارے بچوں اور نوجوانوں نے
ظلم کے خلاف آواز اٹھائی
سب اسلحہ اسرائیلی فوجیوں کے پاس تھا
ہم نے ان کا پتھروں سے مقابلہ کیا
وہ مزاحمت کی جنگ انتفادہ کہلائی
وہ ایک سیاسی آواز تھی
اپنے حقوق حاصل کرنے کی آواز
انصاف کی آرزو کی آواز

لیکن اس آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی
اور مشہور کر دیا گیا کہ
عرب دہشت پسند ہیں
اس لیے اب
ان عرب علاقوں میں کوئی ٹورسٹ نہیں جاتا
گلیاں اور بازار سنسان ہو گئے ہیں
کاروبار ویران ہو گئے ہیں
عرب بھوکے ہیں
ان کے مکان کچے ہیں
لیکن یہودیوں کی پکی آبادیاں بن رہی ہیں
خوبصورت عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں
پچھلے چالیس سال میں
لاکھوں فلسطینی شہر چھوڑ کر چلے گئے
لیکن
لاکھوں یہودی شہر میں آ بسے
ہم گھٹتے جا رہے ہیں
وہ بڑھتے جا رہے ہیں
آخر اس کا کیا انجام ہو گا

ہم اس خیال سے ہی خوف کھاتے ہیں

میں ایک انجینئرنگ کمپنی میں کام کیا کرتا تھا
لیکن پھر میں نے سوچا
ایک یہودی کی نوکری سے بے روزگاری بہتر ہے
اب میں بدوؤں کے ساتھ رہتا ہوں
بے گھری کا خیمہ اٹھائے اٹھائے پھرتا ہوں
اپنے بچوں کو بکریوں کا دودھ پلاتا ہوں
اور ان کو
اپنی بانسری سے
آزادی کے نغمے سناتا ہوں
میں اس دن کی امید پر زندہ ہوں
جب میرے بیٹے نہیں تو پوتے
دوبارہ
فلسطین کا پاسپورٹ حاصل کر سکیں گے
اور ہمارا گھر
ہمارے پاس لوٹ آئے گا

ہمیں ایک یہودی عورت ملی

کہنے لگی

میرا نام لوئس ہے

میری دھرتی لیبیا کی دھرتی ہے

میرے والدین بھی وہیں پیدا ہوئے تھے

لیکن

ہماری دھرتی ماں نے ہم سے

سوتیلوں کا سا سلوک کیا

ہم پر لیبیا کی زمین تنگ ہو گئی

چھ دن کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد

سڑکوں پر یہودیوں کی لاشیں پائی گئیں

ان دنوں میں اپنی سہیلی اور اس کے والدین کے ساتھ

تیونسیا میں تھی

مجھے میرے ہمدردوں نے بتایا کہ

میری جان خطرے میں تھی

نہ میں تیونسیا میں رہ سکتی تھی

نہ واپس لیبیا جا سکتی تھی

آخر میرے یہودی باپ کے ایک مسلمان دوست نے

میری جان بچائی

مجھے روم کا ٹکٹ دے کر اٹلی بھیج دیا

لیکن
مجھے روم کے ایر پورٹ پر روک دیا گیا
کہنے لگے
تمہارے پاس اٹلی کا ویزا نہیں ہے
تم واپس لیبیا چلی جاؤ
میں اس وقت ایک بچی تھی
اور عالمی سیاست سے بے خبر
مجھے لوگوں نے بتایا کہ
اگر میں واپس لیبیا چلی گئی تو
زندہ واپس نہ بچوں گی
میں ہوائی اڈے پر گھنٹوں روتی رہی
خوف سے تھر تھر کانپتی رہی
مجھے موت سے لوری دینی چاہی
لیکن میں
زندگی سے گلے ملنے کو ترستی رہی
آخر مجھے اپنے ماموں کا فون نمبر یاد آیا
جو روم میں مقیم تھے
ایک پولیس افسر نے فون کیا تو
میرے ماموں کے دوست نے اٹھایا

وہ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے
انہوں نے میری جان بچائی
میں اتنی وحشت زدہ تھی کہ
میری نظروں میں اپنی لاش گھوم رہی تھی
میں اتنی دہشت زدہ تھی کہ مجھے
پہلی دفعہ وہ کہانی سنانے میں
بیس سال لگے
اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد
میں اٹلی سے اسرائیل چلی آئی
ہمارا خاندان بکھر گیا
ہمارے خواب بکھر گئے
ہم ظلم کی چکی میں پستے رہے
ہم ساری دنیا میں مظلوم و مقہور ٹھہرے
ہمیں دنیا میں کسی نے امان نہ دی
ہمیں دنیا میں کہیں سکون نہ ملا

ہم یہودی
سینکڑوں سالوں سے ملعون و مطعون ٹھہرائے گئے
کہیں ہم زندہ جلادیئے گئے
کہیں ہم بھوک کا نشانہ بنے

کہیں ہمیں سیاسی ناگ ڈس گئے
کہیں ہمیں تعصب کے بچھوؤں نے ڈنک مارا
اور ہم
آج بھی
اپنے مستقبل سے بے خبر
ہر دن کو
قیامت کا دن سمجھ کر گزارتے ہیں
ہم کل بھی مظلوم تھے
ہم آج بھی مظلوم ہیں
ہمیں امید ہے کہ ایک دن
ہم اپنے گھر واپس چلے جائیں گے
لیکن وہ گھر اب
نجانے کہاں ہے

ہر آنکھ میں غم کا آنسو
ہر چہرے پر خوف کی زردی
ہر ذہن میں ماتمی نوحہ
ہر دل میں امن کی امید
چاہے وہ اسرائیلی عورت ہو یا عرب مرد

چاہے وہ عیسائی بچہ ہو، مسلمان نوجوان یا یہودی بوڑھا

ہر گھر میں بے کلی کے چراغ

ہر دیوار پر آسیب کے سائے

ہر کھڑکی پر خوف کی سلاخیں

ہر گلی میں خون کے چھینٹے

ہر بازار میں دہشت کی پرچھائیاں

ہر چوراہے پر انصاف مصلوب

ہر عبادت گاہ میں حق سنگسار

ہر سکول میں جہالت رقص کناں

ہر ایوانِ سیاست میں تعصب خندہ زن

اس شہر کا ہر شہری

مظلوم و مقہور و مجبور

چاہے وہ اسرائیلی عورت ہو یا عرب مرد

چاہے وہ عیسائی بچہ ہو، مسلمان نوجوان یا یہودی بوڑھا

بدو

نہ ہم کسی کو خط لکھتے ہیں
نہ کوئی ہمیں فون کرتا ہے
نہ ہم ٹی وی دیکھتے ہیں
نہ فریزر میں گوشت سنبھال کر رکھتے ہیں
ہمارا طرزِ حیات ہزاروں سالوں سے نہیں بدلا
ہم آج بھی خیموں میں رہتے ہیں
کھلے آسمان تلے سوتے ہیں
تازہ ہوا میں سانس لیتے ہیں
کھجوریں کھاتے اور بکریوں کا دودھ پیتے ہیں
ہم اپنے بچوں کو بانسری بجانا
اور امن کے گیت گانا سکھاتے ہیں
ہمارا رشتہ اس دھرتی سے نہیں ٹوٹا
ہم کبھی کبھار بستیوں اور شہروں کے قریب سے گزرتے ہیں
تاکہ ہمارے بچے
ان لوگوں کا طرزِ حیات دیکھ سکیں
جو وادیوں اور پہاڑوں کو چھوڑ کر

شہروں میں جا بسے ہیں
جو کارخانوں کے زہریلے دھوئیں میں سانس لیتے ہیں
دفتروں کی جہنم میں جلتے ہیں
کاروں اور بسوں میں بے مقصد گھومتے ہیں
بچوں کو ایسے سکولوں میں بھیجتے ہیں جہاں
جہالت کی تعلیم دی جاتی ہے
بھوک اور خوف کی فضا میں جیتے ہیں
ایوانِ سیاست میں تعصب کی آگ بھڑکاتے ہیں
انہوں نے
انسانوں کو قومیتوں میں
اور دھرتی کو
ملکوں میں بانٹ دیا ہے
ہم ایوانِ سیاست سے دور
فطرت کے قریب رہتے ہیں
ہم آزاد منش لوگ ہیں
اور آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں

ساتواں باب

فلسطین اور اس کے مسائل

کڑوی فصل

جب ہم فلسطین کی مقدس سرزمین کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں تو ہمیں شاہ سلیمان کا واقعہ یاد آجاتا ہے جس کے دربار میں دو عورتیں ایک بچے کو لے کر حاضر ہوئیں تھیں اور دونوں عورتوں کو بچے کی حقیقی ماں ہونے کا دعویٰ تھا۔ سلیمان کی دانشمندی نے تو بچے کو دو حصوں میں کٹ جانے سے بچا لیا تھا لیکن اس کے تین ہزار سال بعد کے سیاستدان اتنے دانشمند نہ تھے کہ فلسطین کو تقسیم ہونے سے بچا سکتے۔

جب کسی بھی خطہ زمین کی تقسیم عوام کی خواہشات کے خلاف بیرونی طاقتوں کے جبر سے ہوتی ہے، چاہے وہ کوریا ہو، ویت نام ہو، جرمنی ہو یا فلسطین تو اس کے دردناک نتائج مرتب ہوتے ہیں اور تاریخ کی ان ناانصافیوں کو دور کرنے میں بعض دفعہ عوام کو ایک طویل عرصہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ فلسطین کی تقسیم کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس تقسیم کی وجہ سے لاکھوں افراد اور گھرانے بے گھر ہوگئے جو آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا بھر کے یہودیوں پر جو ظلم و ستم ہوئے تھے ان کے بارے میں ساری دنیا کے باضمیر لوگ فکرمند تھے اور ان کے حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں صیہونی تحریک نے دنیا کے صاحبِ اختیار گروہوں کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی دباؤ ڈال کر یہ قائل کرا لیا تھا کہ بیسویں صدی میں یہودیوں کے مسائل کا حل اسرائیل کا قیام ہے۔

اگرچہ بہت سی تنظیمیں اور قومیں جو یہودیوں کے مسائل کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتی تھیں وہ بھی اسرائیل کے قیام کے بارے میں فکر مند تھیں۔ انہیں یہ خدشہ تھا کہ اس سے مشرقِ وسطیٰ اور فلسطین کے مسائل کم نہیں ہوں گے بلکہ اور بڑھ جائیں گے وہ یہودیوں کے مسائل کے بارے میں تو فکر مند تھیں لیکن ان مسائل کے صیہونی حل کے حق میں نہیں تھیں۔

۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کے نمائندے فولک برناڈوٹ (Folke Bernadotte) نے سیکورٹی کونسل میں اپنی تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ "فلسطین کے یہودی علاقوں میں اگر یہودی مہاجروں کی تعداد بڑھتی گئی تو چند سالوں میں اس سے بہت سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پیدا ہوں گے اور عرب عوام کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔"

اسرائیل کے قیام کے بعد اس کے ایک نمائندے ڈیوڈ بین گیورون (David Ben Guiron) نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا "ہم اپنی ریاست کو صرف قائم ہی نہیں رکھنا چاہتے بلکہ بڑھانا بھی چاہتے ہیں۔" اور دوسرے نمائندے مینوچم بیگن (Menachem Begin) نے کہا تھا "میں عرب ممالک کے خلاف جنگ کے حق میں ہوں تاکہ ان کی طاقت کو کم کیا جائے اور اپنی حدود کو بڑھایا جائے۔"

اسرائیل کے حکام اور نمائندوں کا یہ رویہ اس رویے سے بہت مختلف تھا جس کا اظہار ان کی ۱۹۲۱ء کی صیہونی کانگرس (Zionist congress) میں پیش کیا گیا تھا اس کانگرس میں ایک قرارداد قبول کی گئی تھی جس میں تحریر تھا۔

"ہم پورے خلوص سے اعلان کرتے ہیں کہ ہماری خواہش ہے کہ فلسطین میں یہودی اور عرب آپس میں مل جل کر رہیں گے، ایک دوسرے کا احترام کریں گے اور ایک ایسی فضا تیار کریں گے جس میں دونوں قوموں کے لیے خوشی

اور ترقی کے مواقع میسر ہوں گے۔"

افسوس کی بات ہے کہ اسرائیل کے قیام کے بعد فلسطینی نہ صرف بے گھر ہو گئے بلکہ اسرائیل نے ان بے گھر فلسطینیوں کی ذمہ داری بھی عرب ممالک پر ڈال دی اور امید رکھنے لگا کہ وہ فلسطینیوں کی مستقل رہائش کا بندوبست کریں۔

اسرائیل کے قیام کے بعد حالات اتنے ابتر ہو گئے کہ اسرائیل کے باضمیر لوگ خود اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ ٹیل آویو (Tel Aviv) کے نیتھن جبوفشی (Nathan Chufshi) نے ایک دفعہ کہا تھا "اب ایک داخلی انقلاب ہی یہودیوں کو عربوں کے خلاف نفرت کی بیماری سے بچا سکتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا جلد یا بدیر اقرار کرنا ہو گا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ ناانصافیاں کی ہیں اور ہم نے ان کی زمینوں اور کھیتوں پر اپنے سکول اور عبادت گاہیں بنائی ہیں۔ ہمیں ایک دن اپنے گریبانوں میں خود جھانکنا پڑے گا۔"

فلسطینیوں کی موجودہ صورتِ حال اور ان کے داخلی اور خارجی تضادات کو سمجھنے کے لیے ہمیں فلسطین کے تاریخی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی پس منظر کا مطالعہ کرنا ہو گا تاکہ ہم ان کے حال کو ماضی کی روشنی میں دیکھ سکیں۔

فلسطین - زرخیز سرزمین

فلسطین کا علاقہ ۱۰۴۳۵ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے جس میں سے ۱۰۱۶۳ مربع میل زمین ہے اور ۲۷۲ مربع میل پانی۔ پانی کے علاقے میں ہولے کی جھیل (۵ مربع میل Lake Huleh) تبریاس کی جھیل (۶۲ مربع میل Lake Tiberias) اور آدھا بحیرہ مردار (۲۰۵ مربع میل Dead sea) شامل ہیں۔ فلسطین کا زمینی علاقہ صدیوں سے کاشتکاری کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

بعض لوگ فلسطین کے بارے میں اس خیال کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ ایک بنجر اور بیابان علاقہ تھا جسے یہودیوں نے آکر آباد کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء کی یہودیوں کی ہجرت سے پہلے بھی وہ بیابان نہ تھا۔ فلسطین میں زیتون، مالٹے (Jaffa Orange) اور دیگر پھلوں اور سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی اور وہ دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے۔ ۱۳-۱۹۱۲ء میں عربوں نے ۲۹۷۰۰۰ پونڈ (۱۴۸۸۵۰۰ ڈالر) کے صرف مالٹے یورپ برآمد کئے تھے۔ یہ ایک مثال اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ فلسطین شروع سے ہی ایک زرخیز علاقہ تھا۔

بدامنی کی ابتدا

اگر ہم فلسطین کی سرزمین پر آباد لوگوں کا تاریخی حوالے سے جائزہ لیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہاں مسلمان، عیسائی اور یہودی جو سب اہلِ کتاب کہلاتے تھے آپس میں دوستوں، بھائیوں اور ہمسایوں کی طرح رہتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

فلسطین کی سرزمین پر سب سے پہلے بدامنی ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئی جب فلسطین میں خارجی یہودیوں کی آمد شروع ہوئی۔ اس کے خلاف مقامی لوگوں نے احتجاج کیا، جوں جوں فلسطینی بے روزگار اور بے گھر ہوتے گئے اور جب انہیں یہودیوں کے صیہونی نظریات اور اسرائیل کے قیام کا اندازہ ہوا تو غصے کی چنگاریاں شعلوں میں ڈھلنے لگیں۔ امریکی یہودی گروہ کے نمائندے گوٹفریڈ نیوبروگر (Gottfried Neubruger) نے ۱۹۶۰ء میں عرب دنیا کے دورے کے بعد لکھا تھا۔

"عرب ممالک کے مسلمان یہودیوں سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ مسلمان یہودیوں کے خلاف نہیں ہیں وہ صیہونی تحریک اور اسرائیل کے قیام کے خلاف ہیں۔"

انگلستان کی منافقت

پہلی جنگ عظیم کے اعلان کے بعد عرب ممالک نے ترکی حکومت سے آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا، اس سلسلے میں وہ انگلستان کی حکومت سے مدد کے طلبگار تھے۔

۱۴ جولائی ۱۹۱۵ء کو جب مکہ کے شریف حسین کے برٹش ہائی کمشنر سر ھنری میکوھن (Sir Henry McMohan) سے مذاکرات ہوئے تو برٹش حکومت نے عرب ممالک کی آزادی کی تحریک میں تعاون کا وعدہ کیا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ بظاہر برٹش حکومت عرب ممالک سے وعدہ کر رہی تھی لیکن درپردہ وہ فرانس اور روس کی حکومتوں سے عرب ممالک کی تقسیم اور بالادستی کے بارے میں مذاکرات کر رہی تھی۔

The Balfour Declaration (1917)

۱۸۷۹ء سے صیہونی تحریک نے اپنی باقاعدہ کاروائی شروع کر دی تھی۔ اس تحریک کا نمائندہ تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ وہاں یہودی آزادی کی زندگی گزار سکیں۔ اس نے ایک دفعہ لکھا تھا

Let the sovereignty be granted us over a portion of the globe large enough to satisfy the rightful requirements of a nation. The shall manage for ourselves.

پہلی جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں سے صیہونی تحریک کو کافی تقویت ملی۔

جب جنگِ عظیم میں انگلستان کی حکومت مشکلات کا سامنا کر رہی تھی اور امریکہ کے تعاون اور جنگ میں شمولیت کا خواہشمند تھی۔ اس وقت جیمز میلکم (James Malcolm) نے انگلستان کے وزارتِ خارجہ کے نمائندے سر مارک سائیکز (Sir Mark sykes) کو مشورہ دیا کہ "تم امریکہ کے اور باقی دنیا کے سارے یہودیوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکتے ہو اگر تم ان کے لیے فلسطین کا ایک حصہ حاصل کرنے کا وعدہ کرو۔"

اس طرح مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے نہ صرف امریکہ نے جنگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا بلکہ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو انگلستان کے وزیرِ خارجہ آرتھر بلفور (Arthur Balfour) نے اس قرارداد پر دستخط کیے جو بعد میں بہت بدنام ہوئی اور آج تک بلفور کا نام لیے ہوئے ہے۔ اس قرارداد میں درج ہے۔

"صیہونی تحریک کے نمائندوں نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اگر متحدہ محاذ (Allies) نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک ریاست قائم کرنے کا یقین دلادیا تو وہ ساری دنیا میں یہودیوں سے درخواست کریں گے کہ وہ متحدہ محاذ کا ساتھ دیں۔"

جب یہودیوں کے لیے فلسطین میں علیحدہ ملک کے قیام کی بات آگے بڑھی تو عرب ممالک میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس تشویش کے جواب میں انگلستان کی حکومت نے ایک پیغام جاری کیا جو British Hograth Message کہلاتا ہے۔ وہ جنوری ۱۹۱۸ء میں بھیجا گیا تھا، اس میں لکھا تھا: "فلسطین میں یہودیوں کی آمد کی اسی صورت میں اجازت دی جائے گی اگر اس سے عربوں کی معاشی اور سیاسی آزادی پر مضر اثرات مرتب نہ ہوں گے۔"

آسمانی وعدہ

صیہونی تحریک کے نمائندوں نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چار ہزار سال پہلے خدا نے اپنی آسمانی کتاب میں ابراہیم سے فلسطین سے ان الفاظ میں وعدہ کیا تھا۔

"Unto thy seed have I given this land"

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس تحریک کے نمائندے ابراہیم کی اولاد میں صرف اسحاق کی نسل کے یہودیوں کو شمار کرتے ہیں جبکہ ماہرین کا خیال ہے کہ ابراہیم کی اولاد میں اسماعیل کی نسل کے عیسائی اور مسلمان بھی شامل ہیں اس طرح بعض ماہرین ابراہیم کی اولاد میں تمام خدا کے ماننے والوں کو شمار کرتے ہیں۔

صیہونی تحریک کی اس محدود تفسیر سے اور بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں مثلاً وہ یہودی جو ابراہیم کی اولاد سے ہیں ہی نہیں جن میں مالا بار (Malabar) کے کالے یہودی بھی شامل ہیں۔

صیہونی تحریک کا مقصد یہودیوں کے مسائل کا سیاسی حل تلاش کرنا تھا اور ایسا ملک بنانا تھا جہاں وہ آزادی اور خودمختاری کی زندگی گزار سکیں۔ اس سیاسی حل نے یہودیوں کے بارے میں بہت سے مذہبی، نسلی اور قومی مسائل کو الجھا کر رکھ دیا۔

امریکہ کے ایک ماہر ہیری شیپرو (Harry Shapiro) لکھتے ہیں:

Jews are not a clan, Tribe or in a strict sense a nation

آج کے دور میں یہودیوں میں ہر رنگ، نسل اور قوم کے لوگ شامل ہیں جو دنیا کے چاروں کونوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہودی مسائل اور صیہونی تحریک

یہودی وہ لوگ ہیں جو صدیوں سے آسمانی مذہب کے پیروکار ہیں اور عالمی برادری کے ماننے والے ہیں۔ جبکہ صیہونی تحریک ایک سیاسی تحریک ہے جس کے سیاسی مقاصد ہیں، اس تحریک نے یہودیوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ باقی مذاہب اور اقوام کو بھی متاثر کیا ہے۔ دنیا بھر کے یہودیوں نے صیہونی تحریک کی ابتدا سے ہی مخالفت کی تھی۔

پروفیسر ولیم ھوکنگ (William Hocking) نے ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا۔

"Political zionists are the Chief enemies of the Jewish interest in the world of Tomorrow"

"صیہونی تحریک دنیا بھر میں یہودیوں کے مفاد کی دشمن ہے۔" ان کا خیال ہے کہ اس تحریک نے چاروں طرف تعصب اور نفرت کے بیج بوئے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام سے صیہونی تحریک کا سیاسی خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور فلسطین کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اسرائیل کے قیام کے بعد اس کے نمائندوں نے دنیا بھر کے یہودیوں کو بلانا شروع کر دیا۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں ڈیوڈ بین گوریون (David Ben Guiron) نے پچیسویں عالمی صیہونی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسرائیل نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں، اس نے دنیا بھر کے یہودیوں کو اسرائیل ہجرت کرنے کا مشورہ دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ جو ہجرت نہیں کریں گے وہ (GODLESS) قرار دیے جائیں گے۔

بعض یہودی ماہرین کا خیال ہے کہ صیہونی تحریک نے یہودیوں کے

موقف کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچایا ہے اور یہودیوں کے لیے اسرائیل سے باہر دوسرے ممالک میں امن اور سکون کی زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔

انگریزی تاریخ دان آرنلڈ ٹوئن بی ARNOLD TOYNBEE نے ۱۹۶۱ء میں کہا تھا کہ Antisemitism اور Zionism میں ایک قدر مشترک ہے دونوں تحریکوں کے نمائندوں کا ایمان ہے کہ یہودیوں کو باقی لوگوں سے علیحدہ رہنا چاہیے کیونکہ وہ باقی قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے بعض کا خیال ہے کہ صیہونی تحریک ہٹلر کی یہودیوں سے دشمنی کے ردِ عمل میں بنی ہے۔

فلسطین میں یہودیوں کی آمد

ترکوں سے عربوں کی جنگ کا خاتمہ ہوا تو باقی ممالک کے ساتھ ساتھ فلسطین نے بھی جنوری ۱۹۱۹ء میں آزادی حاصل کی لیکن اسے باقی ممالک (شام، عراق) کی طرح خود مختاری حاصل نہ ہوئی اس کی ایک وجہ Balfour Declaration تھی جس کی وجہ سے انگلستان اور لیگ آف نیشنز (League of Nations) نے مسلمانوں اور عیسائیوں سے مشورہ کیے بغیر صیہونی تحریک کے نمائندوں سے کچھ وعدے کر لیے تھے۔

یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو فلسطین میں Civil Administration کا قیام وقوع پذیر ہوا جس میں انگلستان کی صیہونی تحریک کے یہودیوں کو کلیدی حیثیتیں حاصل تھیں۔

فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت بڑھتی گئی اور انہوں نے وہاں کی زمینیں خریدنی شروع کر دیں۔

آبادی	۱۹۱۸ء	۱۹۴۴
مسلمان	۵۷۴۰۰۰	۱۰۶۱۲۷۷
عیسائی	۷۰۰۰۰	۱۳۵۵۴۷
یہودی	۵۶۰۰۰	۵۲۸۷۰۲

۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۴ء تک یہودیوں کی آبادی ۸ فیصد سے بڑھ کر ۳۱ فیصد ہو گئی۔

۱۹۱۴ء میں یہودیوں کے پاس فلسطین کا دو فیصد علاقہ تھا، ۱۹۴۶ء میں تقریباً پندرہ فیصد ہو گیا تھا۔

اس تبدیلی سے فلسطین کے معاشرتی اور سیاسی مسائل میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔

حیرانی

اسرائیل کے اپنے ملک کی آزادی کے اعلان کے گیارہ منٹ بعد امریکہ کے صدر ہیری ٹرومین (Harry Truman) نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ یہ عمل اتنا جلد ہوا کہ صیہونی تحریک کے نمائندے خود بھی حیران پریشان ہو گئے۔ امریکہ کے اقوامِ متحدہ کے نمائندوں نے بھی یہ خبر روس کے نمائندوں سے سنی۔

مشرقِ وسطیٰ میں امن

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ
فلسطینیوں کے مسائل کا حل

اور

ان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے بغیر
مشرقِ وسطیٰ میں امن کا خواب
شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا

(سیمی ہدوی Sammi Hadawi کی کتاب کڑوی فصل (Bitter Harvest) کے چند اقتباسات)

آٹھواں باب

اقوامِ متحدہ اور فلسطین کا مسئلہ

فلسطین کی تقسیم

۱۹۴۵ء میں جب دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تو فلسطین کا علاقہ ۱۹۲۲ء کے لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے فیصلے کے مطابق برطانیہ کے اختیار میں تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے فلسطین کے علاقے میں یہودیوں کی ہجرت بڑھتی جارہی تھی جس سے مقامی فلسطینی خوش نہیں تھے۔ برطانیہ کی حکومت نے اپریل ۱۹۴۷ء میں فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ کے سامنے رکھا تاکہ اس کا کوئی تسلی بخش حل تلاش کیا جا سکے۔ اقوامِ متحدہ کی عمر اس وقت صرف دو سال کی تھی کیونکہ اس کی تشکیل جون ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو میں ہوئی تھی۔

برطانوی حکومت نے درخواست دی کہ فلسطین کا مسئلہ جنرل اسمبلی کے عمومی اجلاس میں زیرِ بحث لایا جائے اور ایسی کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو اس مسئلے پر خصوصی رپورٹ پیش کرے۔

۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کے لیے ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دینے کے لیے جنرل اسمبلی کا نیویارک میں خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ اس دوران پانچ عرب ممالک (مصر، عراق، لبنان، سعودی عرب اور شام) نے کوشش کی کہ اس اجلاس کے ایجنڈے میں فلسطین کی آزادی کا سوال بھی اٹھایا جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس خصوصی اجلاس میں گیارہ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس سے کہا گیا کہ وہ فلسطین کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور غور وخوض کر کے اسمبلی کے ستمبر ۱۹۴۷ء کے اجلاس کے لیے رپورٹ تیار کرے۔ ان تین مہینوں کے دوران کمیٹی نے فلسطین، لبنان، شام اور اردن کا دورہ کیا۔

اس تحقیق کے دوران یہودی اداروں نے تو کمیٹی کے ساتھ تعاون کیا لیکن

عرب اور فلسطینی اداروں کے نمائندوں نے یہ کہہ کر تعاون کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کی فلسطین کی آزادی کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ عرب لیگ کا اصرار تھا کہ فلسطین کی آزادی کو زیر بحث لایا جائے۔

خصوصی کمیٹی نے ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی رپورٹ مکمل کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ فلسطین سے برطانیہ کی بالادستی اور اختیار ختم ہونا چاہیے لیکن فلسطین کے مستقبل کے بارے میں دو مختلف حل پیش کیے گئے۔

کمیٹی کی اکثریت (جس میں کینیڈا، چیکوسلواکیہ، گوئٹے مالا، نیدرلینڈ، پیرو، سویڈن اور اوروگوے شامل تھے) نے مشورہ دیا کہ فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہودی ریاست

اور

عرب ریاست

اور یروشلم کے شہر کو اقوامِ متحدہ کی تحویل میں رکھا جائے اور تینوں علاقوں کے درمیان ایک معاشی معاہدہ قائم کیا جائے۔

کمیٹی کی اقلیت (جس میں ہندوستان، ایران اور یوگوسلاویہ شامل تھے) نے یہ مشورہ دیا کہ پورے علاقے کو آزادی دے دی جائے، یروشلم اس کا دارالخلافہ ہو اور اس کے تحت ایک عرب ریاست ہو اور ایک یہودی ریاست۔ آسٹریلیا نے ان دونوں مشوروں کو یہ کہہ کر قبول نہ کیا تھا کہ کمیٹی کو ایسے فیصلے کرنے اور مشورے دینے کا اختیار نہیں ہے۔

جنرل اسمبلی کے اجلاس میں دو مہینوں کی بحث کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو قرارداد نمبر ۱۸۱ کو چند ترمیموں کے بعد قبول کر لیا گیا۔ اس قرارداد کے تحت

برطانیہ کو فلسطین میں اپنا اثرورسوخ ختم کرنا تھا اور اپنی فوجیں واپس بلانی تھیں۔

یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء تک عرب اور یہودی ریاستوں کے درمیان حدیں قائم ہونی تھیں (فلسطین کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، تین حصے عرب ریاست میں، تین حصے یہودی ریاست میں شامل ہونے تھے اور دو حصے اقوامِ متحدہ کے زیرِ اثر رہنے تھے)

یہ تبدیلیاں بتدریج اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی ہونی تھیں۔

اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کو یہودی ایجنسی نے تو قبول کر لیا تھا لیکن فلسطینی عربوں اور عرب ممالک نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان فیصلوں میں اقوامِ متحدہ نے اپنے چارٹر کی خلاف ورزی کی تھی، فلسطینیوں کو حقِ خودارادیت نہ دیا تھا اور ان کی مرضی کے خلاف فلسطین کی یہودی اقلیت کو خصوصی اختیارات دے دیے گئے تھے۔

اقوامِ متحدہ میں قرارداد نمبر ۱۸۱ کے پاس ہونے کے بعد فلسطین میں تشدد کا اضافہ ہوا۔ جب حالات ابتر ہوتے چلے گئے تو جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس بلایا گیا جو ۱۶ اپریل سے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء تک قائم رہا۔ اس اجلاس میں فلسطین میں فوجی کاروائیوں پر پابندی لگائی گئی اور سویڈش ریڈ کراس کے صدر (Count Folke Bernadotte) کے زیرِ نگرانی ایک ایسا کمیشن تیار کیا گیا جس کا کام فلسطین میں تشدد کو ختم کرنا تھا۔

If fully implemented, the Partition Plan would have created an Arab state and a Jewish state in a divided Palestine, with an international regime for Jerusalem. By the time the fighting subsided in July 1948, Israel controlled a significant part of the land allotted to the Arab state, while Egypt and Jordan administered the remaining territory.

MAPS
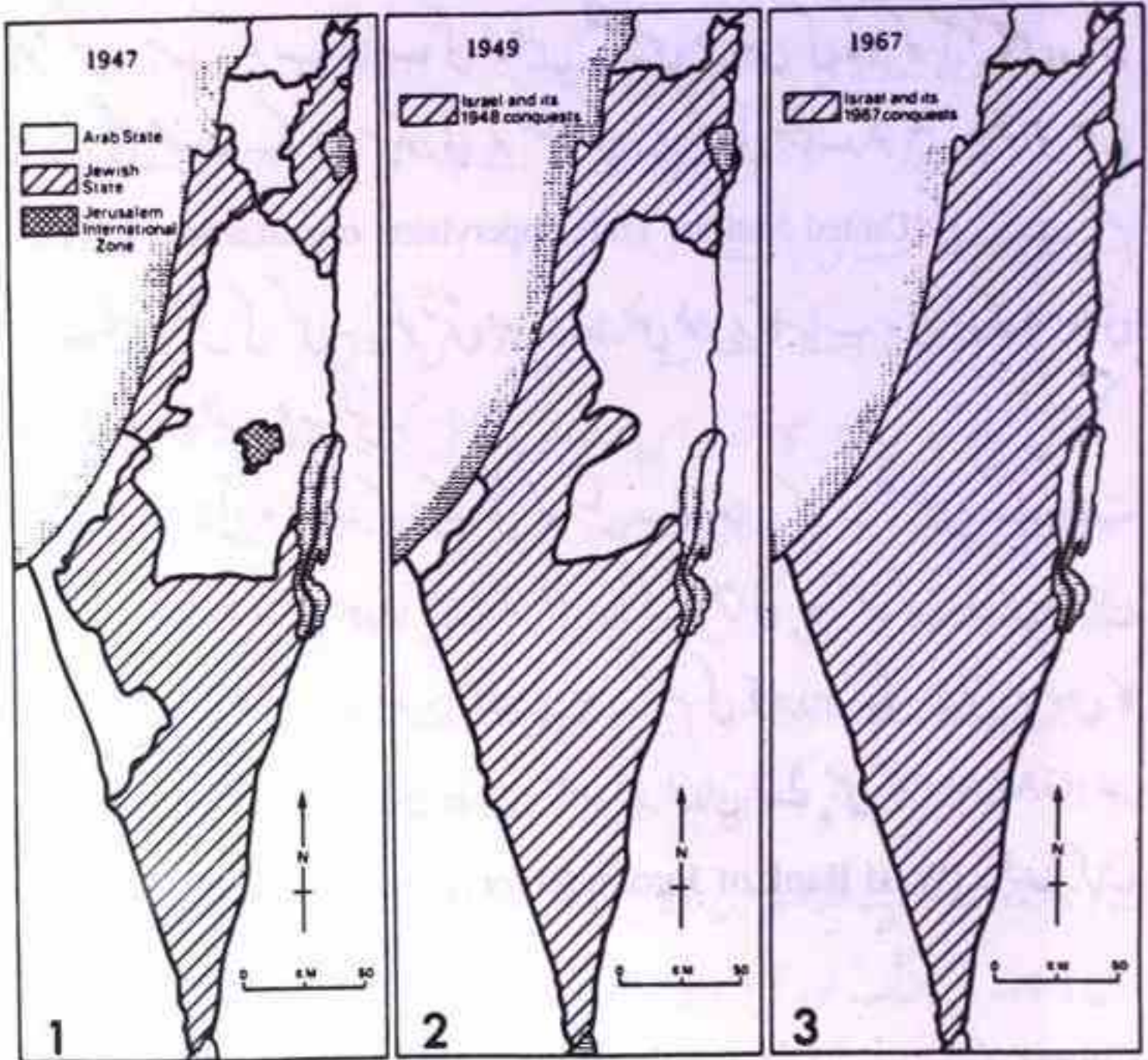
The takeover of Arab Palestine:
1. The U.N. Partition Plan of 1947.
2. Israel after the 1948 War.
3. Israel after the Six-Day War of 1967.

اسرائیل کی پیدائش

۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ فلسطین سے دست کش ہو گیا اور اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ اسی دن یہودی ایجنسی نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان سے یہودی اور عرب قوموں کے درمیان تضاد اتنا بڑھا کہ جنگ چھڑ گئی۔ ہمسایہ عرب ممالک کی فوجیں فلسطینی عربوں کی مدد کو آ پہنچیں، کئی ہفتوں کی محنت کے بعد سیکورٹی کونسل کی زیرِ نگرانی جنگ کو بین الاقوامی فوج (United Nations Trule supervision organization) UNTSO کی مدد سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش صرف عارضی طور پر کامیاب ہوئی کیونکہ ۹ جولائی کو لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی۔

۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو سیکورٹی کونسل نے اعلان کیا کہ فلسطین کے حالات امن کے لیے خطرہ ہیں اور جانبین کو حکم دیا کہ وہ لڑائی کو ختم کریں، اس دوران اسرائیل نے یروشلم کے مغربی حصے پر جو تقسیم کی قرارداد کے مطابق عربوں کا حصہ تھا، قبضہ کر لیا تھا، اسی دوران مصر اور اردن نے بھی گازا (GAZA) اور دریائے اردن کے مغربی کنارے (West Bank of Jordon River) پر قبضہ کر لیا تھا۔

اسرائیل، فلسطین اور یروشلم کے حالات اتنے ابتر ہوئے کہ (Count Bernadotte) کو، جو امن کے مذاکرات میں مصروف تھے، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے مقبوضہ یروشلم میں قتل کر دیا گیا۔

۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو اسرائیل اقوامِ متحدہ کا ممبر بن گیا۔ ممبر بنتے وقت اسرائیل کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی یاددہانی کرائی گئی جس میں مہاجرین اور سرحدوں کے مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔

قرارداد ۱۹۴

جنرل اسمبلی کے تیسرے اجلاس میں قرارداد نمبر ۱۹۴ کو قبول کیا گیا جس میں فلسطین کے مسئلے کا حل پیش کیا گیا۔ اس قرارداد کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

مہاجر عربوں کو واپس آنے کی اجازت دی جائے۔

جو مہاجر واپس نہ آنا چاہیں ان کی مالی امداد کی جائے۔

شہر یروشلم کو فوج سے خالی کر کے پر امن علاقہ بنایا جائے اور مقدس مقامات کی حفاظت کی جائے۔

اس قرارداد کے تحت تین ممبروں (فرانس، ترکی اور امریکہ) پر مشتمل ایک کمیشن تیار کیا گیا جس کا مقصد اس قرارداد پر عمل کرانا تھا۔ اس کمیشن نے اپریل ۱۹۴۹ء میں مصر، اردن، لبنان، شام اور اسرائیل سے دستخط کروائے اور وعدہ لیا کہ وہ قرارداد ۱۹۴ پر عمل کریں گے لیکن یہ کوشش ناکام رہی کیونکہ عرب ممالک مہاجرین کے مسئلے کو اور اسرائیل سرحدوں کے مسئلے کو پہلے حل کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۵۱ء سے یہ کمیشن ہر سال رپورٹ پیش کرتا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں ناکام رہا ہے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ اور قرارداد ۲۴۲

عرب اسرائیل تضاد کی چنگاریاں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں سلگتی رہیں۔ مصر نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو نہرِ سویز (Suez Canal) پر قبضہ کر لیا۔ ۲۹ اکتوبر کو اسرائیل نے مصر کے خلاف فوجیں تیار کر لیں، اس تیاری میں فرانس اور برطانیہ نے اسرائیل کا ساتھ دیا۔ جنرل اسمبلی نے مداخلت کی اور ایمرجنسی فوج United nations emergency force سے اس تضاد کو ختم کیا لیکن وہ امن عارضی ثابت ہوا کیونکہ ۱۹۶۷ء میں ان چنگاریوں نے جنگ کے شعلوں کی صورت اختیار کر لی۔

مصر کی درخواست پر مئی ۱۹۶۷ء کو اقوامِ متحدہ کی فوجیں واپس بلالی گئیں کیونکہ مصر نے یقین دلایا کہ وہ اپنی فوجیں واپس بلا لے گا لیکن ۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل اور مصر، اردن، شام کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ اس سے پیشتر کہ سیکورٹی کونسل موثر ہوتی اسرائیل نے مصر کا سینا (Egyptian sinai) گازا (Gaza strip) مغربی کنارا (مشرقی یروشلم سمیت) West bank (Including east jerusale) اور شام کے گولان (Syrian Golan) پر قبضہ کرلیا تھا۔

جنگ ختم ہوئی تو سیکورٹی کونسل نے قرارداد ۲۳۷ پاس کی جس کے تحت اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ مقبوضہ علاقوں کے لوگوں کا تحفظ کرے۔ جنرل اسمبلی نے مختلف ممالک سے درخواست کی کہ وہ جنگ سے متاثر لوگوں کی مدد کریں۔ جنرل اسمبلی نے اسرائیل کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنے جارحانہ اقدامات کو ختم کرے۔

۲۲ نومبر کو سیکورٹی کونسل نے قرارداد ۲۴۲ کو منظور کیا جس کے تحت مشرقِ وسطیٰ میں دائمی امن قائم کرنے کے لیے دو اصولوں کو ضروری قرار دیا گیا۔

اسرائیل مقبوضہ علاقوں سے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔

اسرائیل ہمسایہ ممالک کی حدود اور شہریوں کے حقوق کا احترام کرے اور ان کے تحفظ کے لیے کسی قسم کا خطرہ پیدا نہ کرے۔

سیکورٹی کونسل نے جلاوطن فلسطینیوں کے مسائل کو منصفانہ طور پر حل کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

مصر اور اردن نے قراداد ۲۴۲ کو قبول کیا اور اصرار کیا کہ اسرائیل سے مذاکرات سے پہلے اسرائیل مقبوضہ علاقوں سے دست کش ہوجائے لیکن اسرائیل مذاکرات سے پیشتر فوجوں کے دست کش ہونے پر رضامند نہ ہوا۔

شام نے یہ کہہ کر قرارداد کو رد کر دیا کہ اس میں اسرائیل کی فوجوں کے

مسئلے کی بجائے عرب ممالک پر پابندیاں لگانے کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

پی ایل او (P.L.O) نے یہ کہہ کر قرارداد پر اعتراض کیا کہ اس نے فلسطین کے مسئلے کو جلاوطنوں کا مسئلہ بنا دیا ہے۔

اس قرارداد کے تحت سیکرٹری جنرل نے سویڈن کے روسی ایمبیسڈر (Gunnar Jarring) کو مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم کرنے کا خصوصی نمائندہ چنا، جس نے ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک مصر، اردن اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات کی فضا ہموار کرنے کی کوشش کی تاکہ قرارداد ۲۴۲ پر عمل ہو سکے۔ فروری ۱۹۷۱ء میں مصر اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات چند قوم آگے بڑھے لیکن اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں سے فوجیں واپس بلانے سے انکار کر دیا۔ یہ مذاکرات ۱۹۷۲ء تک جاری رہے لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔

۱۹۷۳ء کی جنگ

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل، مصر اور شام کے درمیان ایک اور جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔

جنگ سے بعد سیکورٹی کونسل نے پہلے ایمرجنسی فوج اور مئی ۱۹۷۴ء میں United nations Disewgagement Observer force (UNDOF) بھیجی، یہ فوج مسر اور اسرائیل کے امن کے پیمان پر دستخط ہونے کے بعد اسرائیل اور مصر کی سرحدوں سے تو رخصت ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی تک گولان کی پہاڑیوں پر موجود ہے۔ ۱۹۸۹ء میں اس فوج میں ۱۳۵۲ لوگ تھے جن کا تعلق آسٹریا، کینڈا، فن لینڈ اور پولینڈ سے تھا۔

شہرِ یروشلم اور اسرائیل

اقوامِ متحدہ نے یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس

پر کبھی بھی عمل نہ ہوا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ میں اسرائیل نے آدھے یروشلم پر قبضہ کرلیا تھا اور باقی آدھے پر اردن نے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے نہ صرف باقی آدھے یروشلم پر بلکہ کئی اور علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔

اقوامِ متحدہ نے کئی بار اسرائیل سے یروشلم سے دست کش ہونے کا اصرار کیا لیکن اسرائیل نے کبھی اقوامِ متحدہ کی قرارداد پر عمل نہیں کیا۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۵ء کو اسرائیل پارلیمنٹ نے بنیادی قانون (Basic Law) پاس کیا جس کے تحت یروشلم کو اسرائیل کا دارالخلافہ قرار دیا اور وہاں پارلیمنٹ بلڈنگ، ہائی کورٹ اور گورنمنٹ کے دفاتر بنانے کا فیصلہ کیا۔

سیکورٹی کونسل نے ممبر ممالک سے درخواست کی کہ وہ اسرائیل کے اس بنیادی قانون کو قبول نہ کریں کیونکہ اسی قانون سے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۱۹۸۹ء میں ایک دفعہ پھر جنرل اسمبلی نے اعلان کیا کہ اسرائیل کا یروشلم کے مقدس شہر پر اپنا قانون لاگو کرنا غیر قانونی ہے۔

مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل آبادیاں

۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے جو ہمسایہ ممالک کے علاقے قبضہ کرلیے تھے ان علاقوں میں ۱۹۷۱ء سے حکومت نے یہودی مہاجروں کو آباد کرنا شروع کردیا تھا اور ۱۹۷۷ء سے اس عمل کی رفتار میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

مارچ ۱۹۷۹ء میں سیکورٹی کونسل نے یہ فیصلہ سُنایا کہ اسرائیلی حکومت کے یہ اقدامات اس علاقے میں امن قائم کرنے میں دشواریاں کھڑی کریں گے اور اسرائیلی حکومت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان علاقوں میں لوگوں کو آباد کرے۔

کونسل نے اسرائیل کو ہدایت کی کہ وہ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کے علاقوں تک اپنا اثر و رسوخ محدود رکھے، سیکورٹی کونسل نے تین ممبروں (بولیویا، پرتگال اور زیمبیا) پر مشتمل کمیشن بنایا تاکہ وہ ان آبادیوں کے مسئلے کا جائزہ لے سکے۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں کونسل نے کمیشن سے تعاون نہ کرنے پر اسرائیل کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ "اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں میں نئی آبادیاں تعمیر کرنے پر فوراً پابندی لگا دینی چاہیے۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں کونسل نے کمیشن کی جو رپورٹ حاصل کی اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسرائیل نے نئی آبادیاں تعمیر کرنے کے اقدامات ختم نہیں کیے، کونسل کو یہ بھی اطلاع ملی کہ ان آبادیوں میں یہودیوں کو بندوقیں رکھنے کی اجازت ہے جس سے عرب شہریوں کا تحفظ خطرے میں پڑ گیا تھا۔

اسمبلی نے ۱۹۸۳ء میں سیکرٹری جنرل سے درخواست کی کہ وہ مقبوضہ علاقوں کی اسرائیلی آبادیوں کے بارے میں مصنوعی رپورٹ تیار کروائے۔ ۱۹۸۴ء میں جو رپورٹ تیار ہوئی اس سے واضح تھا کہ ان نئی آبادیوں نے فلسطینیوں کے لیے بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں۔

۱۹۸۹ء کی مصنوعی اقدامات میں کمی کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے اور ان میں شدت بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

فلسطینیوں کے حقوق کا اقرار

۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد بین الاقوامی طاقتیں فلسطین اور فلسطینیوں کے مسائل کو ایک وسیع سیاسی پس منظر میں دیکھنے لگیں۔

۱۹۶۴ء میں پی ایل او (P.L.O) معرضِ وجود میں آئی اور اس نے بین الاقوامی برادری سے درخواست کی کہ وہ فلسطینیوں کے حقوق کو نظر انداز نہ کریں

اور ان کی آزادی کی جدوجہد میں مدد کریں۔

۱۹۶۷ء کی قرارداد ۲۴۲ میں "جلاوطن فلسطینیوں کے مسائل کے منصفانہ حل" پر زور دیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں جنرل اسمبلی نے کھل کر اس حقیقت کا اقرار کیا کہ "چونکہ عرب فلسطین اپنے حقوق سے محروم رکھے گئے ہیں اس لیے ان کے مسائل میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔"

جنرل اسمبلی نے سیکورٹی کونسل کی اس طرف توجہ مبذول کروائی کہ اسرائیل کی مقبوضہ علاقوں میں آبادیاں فلسطینی مسائل کی آگ کو ہوا دے رہی ہیں۔

ستمبر ۱۹۷۴ء میں ۵۶ ممبر ممالک نے درخواست کی کہ فلسطین کے سوال (The Question of Palestine) کو جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔

۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء کی قرارداد ۳۲۳۶ نے

فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت

ملکی خود مختاری

جلاوطن فلسطینیوں کے اپنے علاقوں میں واپسی

ان کے گھروں اور زمینوں کی ملکیت

کے حقوق کو تسلیم کیا

۱۹۷۴ء سے اب تک یہ حقوق ہر سال تسلیم کیے جاتے رہے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں اقوامِ متحدہ نے P.L.O کو دعوت دی کہ وہ اسمبلی کی کاروائیوں کو خود دیکھ سکیں۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں جنرل اسمبلی نے فلسطینیوں کے حقوق کے تحفظ کے

لیے ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی کمیٹی نے ۱۹۷۶ء میں دو مشورے دیے۔
(الف) جلاوطن فلسطینیوں کو اپنے علاقوں میں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔
(ب) فلسطینیوں کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنے کا حق دیا جائے۔
سیکورٹی کونسل میں امریکہ نے ان مشوروں کو ویٹو کر دیا۔ ۱۹۸۰ء میں دوبارہ ان مشوروں پر بحث ہوئی لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔

جلاوطن فلسطینی

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے دوران جو لڑائی ہوئی اس کے نتیجے میں ۷۵۰۰۰۰ فلسطینی عرب بے گھر ہو گئے۔ ان جلاوطنوں کی اکثریت West bank چلی گئی۔ بعض Gaza Strip اردن، لبنان، شام اور کئی اور ممالک میں ہجرت کر گئے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ۵۰۰۰۰۰ اور فلسطینی بے گھر ہو گئے جن میں سے ۲۲۰۰۰۰ فلسطینیوں کو دوسری دفعہ ہجرت کرنی پڑی۔

جنرل اسمبلی نے نومبر ۱۹۴۸ء میں پہلی دفعہ ان جلاوطن فلسطینیوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور Unied Nations Relief for Palestinian Refugees (UNRPR) کی تنظیم قائم کی ہور بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے جلاوطن فلسطینیوں کی مدد کی، جب جلاوطن فلسطینیوں کا گھر لوٹ کر جانے کا خواب شرمندہِ تعبیر ہوتا نظر نہ آیا تو ان جلاوطن فلسطینیوں کی رہائش اور ملازمت کا دیرپا حل تلاش کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۴۹ء میں United Nations Relief and Works) Agency for Pelestinian Refugees (UNRWA) جیسی تنظیم قائم کی۔

اس تنظیم نے فلسطینیوں کے خوراک، لباس اور رہائش کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان مسائل کے علاوہ اس تنظیم نے فلسطینیوں کی صحت اور تعلیم کے بارے میں غور و خوض کیا۔

اس تنظیم کے ۱۹۸۹ء کے بجٹ میں

۶۶ فیصد رقم بچوں کی تعلیم

۱۰ فیصد رقم صحت

۱۰ فیصد رقم بنیادی ضروریات پر خرچ کی گئی۔

۱۹۸۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۳ لاکھ فلسطینی اس تنظیم میں رجسٹرڈ ہیں، جن فلسطینیوں کو اقوامِ متحدہ کی WHO اور UNESCO جیس تنظیمیں بھی سہولتیں مہیا کرتی ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا تو فلسطینیوں کے مسئلے میں اضافہ ہوا۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کی بیروت کی جنگ سے حالات مزید ناگفتہ بہ ہو گئے اور ان مسائل کا اب تک کوئی تسلی بخش حل تلاش نہ کیا جاسکا۔

لبنان کا بحران

۱۹۷۰ء کی دہائی میں لبنان مشرقِ وسطیٰ کے تضادات کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۴۹ء کے فلسطینی مہاجروں کی اکثریت نے لبنان کے شہر بیروت اور دوسرے شہروں میں پناہ حاصل کی تھی۔

۱۹۷۲ء میں اسرائیل اور لبنان کے درمیان کشیدگی اتنی بڑھی کہ اسرائیل نے لبنان میں مہاجروں کے کیمپوں پر حملہ کیا۔ اقوامِ متحدہ نے لبنان کی درخواست پر اپریل ۱۹۷۲ء میں حملوں کو ختم کروایا اور امن و سکون کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔

۷۶-۱۹۷۵ء میں لبنان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

اسرائیلی فوجیں مارچ ۱۹۷۸ء میں جنوبی لبنان میں داخل ہو گئیں۔ سیکورٹی کونسل نے اسرائیل کو اپنی فوجیں واپس بلانے کی ھدایت کی۔ لبنان کی

درخواست پر اقوامِ متحدہ نے United Nations Interum force inLabanun (UNIFL)
قائم کی تاکہ سرحدوں کا تحفظ کیا جائے۔
جنوبی لبنان میں حالات کی کشید گی جاری رہی۔
۱۹۸۲ء میں ایک دفعہ پھر اسرائیلی فوجوں نے لبنان کے P.L.O کے مراکز پر ہوائی حملے کیے اور دوبارہ جنگ شروع ہو گئی۔
۵ جون ۱۹۸۲ء کو سیکورٹی کونسل نے قرارداد ۵۰۸ پاس کی جس کے تحت اسرائیل کو لبنان کی سرحد پر جنگ ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ P.L.O نے قرارداد قبول کرنے کا وعدہ کیا۔ اسرائیلیوں نے کہا کہ وہ اس قرارداد کو اسرائیلی کابینہ کے سامنے پیش کریں گے، اگلے دن ۶ جون ۱۹۸۲ء کو اسرائیلی فوجوں نے ایک دفعہ پھر لبنان پر حملہ کر دیا۔ سیکورٹی کونسل نے ایک دفعہ پھر قرارداد ۵۰۹ کے تحت اسرائیل کو اپنی فوجوں کو بلامشروط واپس بلانے کا حکم دیا لیکن اسرائیلی فوجیں آگے بڑھتی چلی گئیں یہاں تک کہ انہوں نے بیروت کا محاصرہ کرلیا۔
جولائی اور اگست ۱۹۸۲ء میں بھی سیکورٹی کونسل اسرائیل کو لبنان کی سرحدوں اور لبنان اور فلسطینی عوام کے حقوق کے احترام کی درخواست کرتی رہی۔
آہستہ آہستہ حالات اتنے ابتر ہو گئے کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اگست ۱۹۸۲ء میں خصوصی اجلاس بلایا گیا تاکہ لبنان اور فلسطینیوں پر اسرائیلی جارحیت کے بارے میں گفتگو کی جاسکے۔ جنرل اسمبلی نے قرارداد ۵۰۸ اور ۵۰۹ کی تائید کی اور اسرائیل کی ان قراردادوں پر عمل نہ کرنے کی مذمت کی۔
اگست ۱۹۸۲ء میں لبنان کی درخواست پر فرانس، اٹلی اور امریکہ نے بین الاقوامی فوج بھیجی تاکہ امن و امان قائم کیا جاسکے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ

لبنان کا صدر بشیر گیمایل (Bashir Gamayal) اور سینکڑوں فلسطینی عوام قتل کردیے گئے۔

سیکورٹی کونسل نے ان قتل وغارت کی وارداتوں کی مذمت کی اور سیکرٹری جنرل سے اقوامِ متحدہ کی فوجوں کو لبنان کی سرحد پر بڑھانے کی درخواست کی۔ اقوامِ متحدہ نے جب ۲۰۰۰ مزید فوجی بھیجے تو لبنان کی حکومت نے انہیں واپس بھیج دیا۔

ستمبر ۱۹۸۲ء میں فرانس، اٹلی اور امریکہ کی فوجیں دوبارہ لبنان پہنچیں برطانیہ نے بھی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں۔ ۱۹ مہینوں کی کشیدگی کے بعد یہ بحران مارچ ۱۹۸۴ء میں ختم ہوا۔

۱۹۸۳ء میں PLO کے مختلف گروہوں میں تضاد پیدا ہوا اور ٹریپولی (Tripoli) میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ یاسر عرفات اپنے دوستوں اور معاونین کے ساتھ وہاں سے ہجرت کر جائے۔

اقوامِ متحدہ نے اپنے جھنڈے تلے پانچ یونانی جہازوں میں یاسر عرفات اور اس کے ساتھیوں کو دسمبر ۱۹۸۳ء میں تیونس (Tunis) بھیج دیا جو اس کے بعد PLO کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔

جنوری ۱۹۸۵ء میں اسرائیلی حکومت نے لبنان کی سرحد سے کچھ فوجیں واپس بلالی تھیں۔ سیکورٹی کونسل کی ہدایت کے مطابق ۱۹۸۹ء سے ۹ ممالک سے آئے ۵۸۰۰ فوجیوں کا دستہ جنوبی لبنان میں متعین ہے۔

مقبوضہ علاقوں میں انسانی حقوق کی پامالی

مقبوضہ علاقوں کے عوام کے انسانی حقوق کی پامالی کے بارے میں ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سیکورٹی کونسل میں قرارداد ۲۳۷ پاس کی گئی جس میں تمام

The Palestinian uprising, intifadah, began spontaneously in December 1987 and focused international attention on the opposition to Israeli occupation and the national aspiration of Palestinians. Picture shows Palestinian demonstrators being dispersed by tear-gas on Nablus Road, East Jerusalem, in December 1988.
Neal Cassidy/Impact Visuals
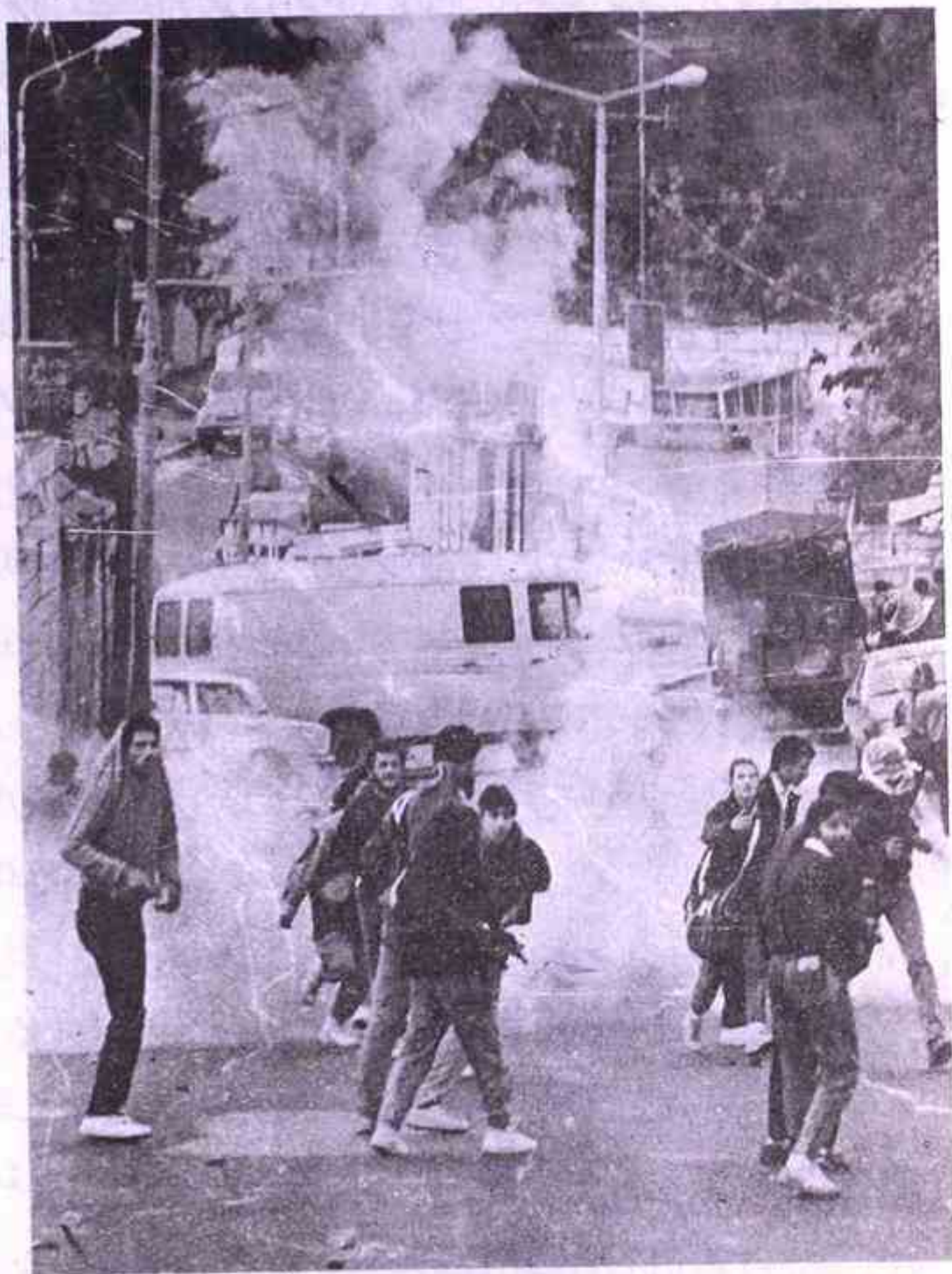
ہمسایہ ممالک کو عوام کے حقوق کے احترام کی تلقین کی گئی اور ۱۹۴۹ء کی جنیوا کنونشن کے اصولوں کی طرف توجہ دلائی گئی جس کے تحت قابض فوجوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عوام کے حقوق کا استحصال کریں۔

دسمبر ۱۹۶۸ء میں جنرل اسمبلی نے خصوصی کمیٹی تشکیل دی تاکہ اسرائیلی حکومت پر کڑی نظر رکھی جائے اور وہ مقبوضہ علاقوں میں ظلم اور جبر نہ کر سکے۔ اسرائیلی حکومت نے اس کمیٹی کے ممبروں کو اپنے فرائض سر انجام دینے کے لیے مقبوضہ علاقوں میں جانے کی اجازت نہ دی۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۹ء تک اس کمیٹی نے مقبوضہ علاقوں میں گئے بغیر دیگر حوالوں سے جمع کی گئی معلومات کی بنیاد پر ۲۱ رپورٹیں فراہم کی ہیں جن میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق فلسطینی عوام کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچائی جارہی ہیں اور اسرائیلی حکومت مسلسل ان مسائل کو نظر انداز کرتی آ رہی ہے۔

انتفادہ

دسمبر ۱۹۸۷ء میں GAZA اور West Bank کے ہنگاموں کے بعد فلسطینی عوام نے انتفادہ کی تحریک شروع کی جس میں اسرائیلی حکومت اور فوج کے فلسطینی عوام پر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور بین الاقوامی برادری کی اس جبر کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔

فلسطینیوں کے حقوق کی کمیٹی نے دنیا بھر کو بتایا کہ مقبوضہ علاقوں کے عوام پر

کرفیو لگائے گئے ہیں۔

سکول اور یونیورسٹیاں بند کر دی گئی ہیں۔

صحت کا نظام غیر تسلی بخش ہے۔

اسرائیلی فوج ناجائز پابندیاں عاید کر رہی ہے اور گلیوں اور بازاروں میں غیر منصفانہ تشدد کا اظہار ہو رہا ہے۔

اس کمیٹی نے ۱۹۸۹ء کی رپورٹ میں بتایا کہ اسرائیلی فوج کے تشدد سے ہزاروں فلسطینی فوجی زخمی اور ان کے گھر اور خاندان تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔

پرامن حل کی تلاش

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سیکورٹی کونسل نے قرارداد ۳۳۸ قبول کی جس میں جانبین سے استدعا کی گئی کہ وہ قرارداد ۲۴۲ کی تمام شقوں پر عمل کریں اور مشرقِ وسطیٰ میں مسائل کا پرامن حل تلاش کریں۔

اقوامِ متحدہ نے روس اور امریکہ کے تعاون سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں بین الاقوامی امن کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں مصر، اسرائیل اور اردن نے شرکت کی لیکن شام شامل نہ ہوا۔ اس کانفرنس میں مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا گیا جس سے اسرائیل اور مصر کے درمیان کچھ مصالحت کی صورت پیدا ہوئی۔

سیکورٹی کونسل کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ مذاکرات اس لیے کامیاب نہیں ہوئے کہ جانبین ایک دوسرے میں اعتماد کھو چکے ہیں اور وہ PLO کی شمولیت پر اتفاقِ رائے نہیں رکھتے جس کی وجہ سے اسرائیل اور PLO کے درمیان کسی قسم کی مصالحت کی صورت نہیں نکلتی۔

اسرائیل اور مصر کے درمیان حالات اس وقت بہتر ہوئے جب مصری صدر انور سادات نے نومبر ۱۹۷۷ء میں یروشلم جانے کا فیصلہ کیا اور مارچ ۱۹۷۹ء میں دونوں ملکوں کے درمیان امن کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کے بعد اسرائیل نے اپریل ۱۹۷۹ء میں صحرائے سینا سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔

یکم ستمبر ۱۹۸۲ء کو اسرائیل کے لبنان پر حملے اور PLO کے مجاہدین کی بیروت سے نقل مکانی کے بعد امریکہ کے صدر رونلڈ ریگن (Ronald Reagan) نے مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کی اردن کے تعاون سے خود مختار ریاست کو اس علاقے میں پائدار امن کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ ریگن نے اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں میں مزید آبادیاں تعمیر کرنے سے بھی روکا۔

اسی مہینے عرب لیگ کی کانفرس میں بھی اسرائیلی حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی سرحدوں کا احترام کرے، اپنی فوجیں واپس بلائے اور فلسطینیوں کو حقِ خود ارادیت سے محروم نہ کرے۔ عرب لیگ نے اقوامِ متحدہ کے سامنے امن کا پلان پیش کیا جس میں فلسطین کی آزادی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اسمبلی نے عرب ممالک کے امن کے پلان کو خوش آمدید کہا۔

جنرل اسمبلی نے اگست ۱۹۸۳ء میں بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تاکہ فلسطین کے مسئلے کا منصفانہ اور حقیقت پسندانہ حل تلاش کیا جاسکے، اس کانفرنس میں ۱۳۷ ممالک نے شرکت کی جن میں سے ۱۱۷ ممبر تھے اور ۲۰ مہمان ممالک تھے، مہمانوں میں PLO کا نمائندہ بھی شامل تھا۔

اس کانفرنس میں امریکہ، روس، عرب ممالک، اسرائیل اور PLO کی شمولیت سے امن کانفرنس کے انعقاد کا مشورہ پیش کیا گیا تاکہ مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کا پائدار حل تلاش کیا جاسکے۔

۱۹۸۸ء میں جب فلسطین کے مسئلے پر جنرل اسمبلی میں مذاکرہ منعقد ہوا تو امریکہ نے یاسر عرفات کو امریکہ داخل ہونے کی اجازت نہ دی، کانفرنس کا جلسہ جنیوا منتقل کرنا پڑا۔ اس مذاکرے کا آغاز یاسر عرفات نے ۱۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کیا۔ اس تقریر میں یاسر عرفات نے فلسطین کو ایک آزاد ریاست [illegible] دیا اور

اسرائیل سے درخواست کی کہ وہ اس تضاد کا پر امن حل تلاش کرے۔

یاسر عرفات نے اقوامِ متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ اور ۳۳۸ اور اقوامِ متحدہ کے مشوروں کو قبول کرنے کا وعدہ کیا۔

دسمبر ۱۹۸۸ء کی قرارداد میں اسمبلی نے یہ بھی پاس کیا کہ آئندہ سے اسمبلی کی کاروائیوں میں PLO کی بجائے فلسطین کا نام استعمال کیا جائے گا۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو فلسطین کا بین الاقوامی دن مناتے ہوئے سیکرٹری جنرل Javier Perez De Cuellar نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔

''میں برسوں سے اس حقیقت کو بیان کر رہا ہوں کہ بین الاقوامی تضادات میں عرب اسرائیل تضاد اپنی اہمیت اور خطرے کی وجہ سے جداگانہ مقام رکھتا ہے اور اسی تضاد کا مرکز فلسطین کا مسئلہ ہے جب تک بین الاقوامی برادری فلسطین کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش نہ کرے گی، مشرقِ وسطیٰ میں دائمی امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، جب تک فلسطینیوں کو دکھوں اور غموں سے نجات نہیں ملے گی اور ان کے حقِ خود ارادیت اور دوسرے حقوق کا احترام نہیں کیا جائے گا، ہم منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

(اقوام متحدہ کی ۱۹۹۰ء کی کتاب

The United Nations and the Question of Palestine

کے اقتباسات)

نواں باب

عرب، فلسطینی شاعری کے تراجم

(عبداللہ اظہری کی کتاب Modern poetry of the Arab world اور سلمیٰ خادرہ جیوسی کی کتاب Modern Palestinian Literature سے انتخاب)

تقسیم کے دن میرا ملک

(۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے کئی ملکوں کی مخالفت کے باوجود فلسطین کی تقسیم کے حق میں فیصلہ دے دیا)

اے میرے ملک! اے عرب ملک!
میری دعا ہے کہ تم تحفظ کی زندگی گزارتے رہو
تمہاری روایت کا موتی مسکراتا رہے
اگرچہ انہوں نے تمہارے درخشاں دل کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں
لیکن وہ تقسیم ہماری غیرت کو گوارا نہیں ہے
ہم نے اپنی شادی کے جوڑے سرخ دھاگوں سے بنے ہیں
وہ دھاگے جو ہمارے خون میں رنگے ہوئے ہیں
ہم اپنا پرچم لیے آگ کے پہاڑ پر چڑھے ہیں
تاکہ ہم اپنی منزل کی طرف سفر کر سکیں

تاریخ ہمارے نقشِ قدم کی پیروی کرتی ہے
عظمت ہمارے ترانے گاتی ہے
اے میرے دوست! اٹھو!
دیکھ کتنے لوگوں کے پاؤں میں زنجیریں ہیں
اور کتنے لوگوں کی ٹانگوں میں ناگ پھنکاریں مارتے ہیں
مغرب نے اپنی قوموں میں ظلم، تشدد پر پابندیاں لگا رکھی ہیں
لیکن ہمارے لیے ان کی اجازت دے رکھی ہے
ان کا کہنا ہے
غلاموں کی تجارت غیر قانونی ہے
کوئی ان سے پوچھے
کیا آزاد لوگوں کی تجارت جرم نہیں؟
مغرب میں انسانوں کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہے
اور
مشرق میں انسان
سنگسار کیے جاتے ہیں
جب مغرب کی زمینوں پر حملہ ہوتا ہے تو
انصاف چیختا اور چنگھاڑتا ہے
لیکن جب

ظلم ہماری زمینوں کا رخ کرتا ہے تو
انصاف خاموش ہو جاتا ہے
عین ممکن ہے انصاف بھی
حالات کے بدلنے سے اپنا رنگ بدل لیتا ہو
ہماری زبانوں پر تالے لگا دیے گئے ہیں
اس لیے ہمارے دلوں کی زبان سنو
اے میرے دوست!
سارے جہاں کے آزاد لوگوں کو پکارو
تاکہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں
انصاف کا پرچم بلند کر سکیں

ابو سلمیٰ

۱۹۰۷--۱۹۸۰ء

مسافر

وہ ریلوے سٹیشن پہنچتا ہے
ٹکٹ خریدتا ہے
اور سفر پر روانہ ہو جاتا ہے
وہ ایسے سورج کا خواب دیکھتا ہے
جو کبھی غروب نہیں ہوتا
وہ ساحلِ سمندر پر آباد
مسافر خانے کے خواب دیکھتا ہے
جس میں وہ
ایک خاموش کھڑکی کے قریب
ایک پھول جیسی عورت کے بستر میں
اس کے بوسوں کی شراب پیتا ہے
وہ تمام عمر

اپنے دن یوں جمع کرتا رہا تھا
جیسے
سمندر چاندنی میں اپنی لہریں جمع کرتا ہے
وہ
ایک طویل عرصے تک
ان کی نگہداشت کرتا رہا تھا
اور پھر
انجانی منزلوں کی طرف چل دیا تھا
کسی نے اس سے پوچھا تھا
"کیا تم نے سفر کرنے کا مناسب دن تلاش کر لیا ہے؟"
اس نے جواب دیا تھا
نہیں
لیکن میں نے وہ سڑک دریافت کر لی ہے
جو
دریا کو اس کے ماخذ سے جدا کرتی ہے

یوسف عبدالعزیز
(۱۹۵۶ء، ---)

جلاوطن

میرے محبوب!
میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ
میں جلاوطن تھا
میں جنگل میں چھپا ہوا تھا
دور افتادہ دنیاؤں کے بھیڑیے
مجھے ریگستانوں اور پہاڑوں میں پریشان کر رہے تھے
اے میرے محبوب!
ہماری جدائی ایک عذاب تھی
میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ
میں بے گھر تھا
ایک انجانے شہر میں مر رہا تھا
اور اکیلا تھا
میرے محبوب!
بغیر ایک گھر کے

عبدالوہاب البیاتی
(۱۹۲۶ء، ---)

عرب مہاجر

چیونٹیاں اس کے گوشت پر رینگتی ہیں
کوے اس کے جسم پر ٹھونگے مارتے ہیں
ایک عرب مہاجر سولی پر لٹک رہا ہے

ایک عرب مہاجر
ریلوے اسٹیشن پر راتیں گزارتا ہے
بھیک مانگتا ہے
زندگی آنسو بہاتے گزار دیتا ہے

انہوں نے صلاح الدین کی یادیں
اس کا گھوڑا
اس کی ڈھال

بیچ ڈالے ہیں
انہوں نے مہاجروں کی قبریں بھی بیچ ڈالی ہیں

کیا کوئی عرب مہاجر کو
ایک روٹی کے ٹکڑے کے عوض
خریدنا چاہتا ہے
میرا خون خشک ہو رہا ہے لیکن
تم ہنستے جا رہے ہو
میں سندباد ہوں
میں اپنے خزانے
اپنے بچوں کے دلوں میں سنبھال کر رکھتا ہوں

چیونٹیاں اس کے گوشت پر رینگتی ہیں
کوے اس کے جسم پر ٹھونگے مارتے ہیں
ایک عرب مہاجر
تمہارے دروازے پر بھیک مانگنے آ گیا ہے

عبدالوہاب البیاتی

(۱۹۲۶ء،---)

اپنا ملک

ایک وہ دن تھا
جب میں
ہلکی بارش میں
تمہاری طرح
اپنی جیبوں میں
شناختی کارڈ تلاش کیا کرتا تھا
ان دنوں
مجھے اس کے کھونے کا غم نہیں تھا
کیونکہ میرا اپنا ایک ملک تھا
ایک یہ دن ہے
جب میں
تیز دھوپ میں

تمہاری طرح
اپنی جیب میں
ورک پرمٹ تلاش کر رہا ہوں
کیونکہ تمہاری طرح
میں بھی اپنا ملک کھو چکا ہوں

ریاض الرئیس
(۱۹۳۷ء، ---)

میں غموں کی ریل گاڑی ہوں

میں نجانے کب سے سفر میں نکلی ہوئی ہوں
اپنے دکھ اپنے دل میں
سگریٹ کا دھواں اپنے سوٹ کیس میں
پرانے محبوباؤں کے پتے اپنی جیب میں
چھپائے ہوئے

ریل گاڑی تیز سے تیز تر چلتی جا رہی ہے
فاصلوں کو طے کرتے ہوئے
کھیتوں اور درختوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے
جھیلوں کے پاؤں چاٹتے ہوئے
انسپکٹر میرا ٹکٹ مانگتا ہے
میری منزل پوچھتا ہے

کیا میری کوئی منزل ہے؟
دنیا کا کوئی ہوٹل مجھے نہیں جانتا
دنیا کا کوئی شخص میری محبوباؤں کے پتے نہیں جانتا
میں غموں کی ریل گاڑی ہوں
میرے سفر میں
ایسے پلیٹ فارم نہیں آتے
جہاں میں رک سکوں
میں سب سٹیشنوں کو پیچھے چھوڑ کر
آگے بڑھتی جا رہی ہوں

نزار قابانی

(۱۹۳۲ء، ---)

وراثت

میرے باپ نے
مجھے اپنی وصیت دکھائی
جس میں اس نے
میرے لیے
ایک نئی جلاوطنی کی پیش گوئی کی تھی
ایک نئی جلاوطنی

اذی دین المناسرا
(۱۹۴۶ء، ---)

افسر اور چڑیا

میں عرب دنیا میں سفر کرتا رہا
تاکہ اپنی نظمیں سنا سکوں
مجھے یقین تھا
شاعری عوام کی روٹی ہے
الفاظ مچھلی ہیں
اور عوام پانی
میں عرب دنیا میں گھومتا رہا
اپنی جیب میں اپنی کتاب لیے
میں جہاں گیا
پولیس اور سپاہیوں نے
مجھے باہر نکال پھینکا
میری جیب میں صرف ایک چڑیا تھی

لیکن افسر
اس چڑیا کا پاسپورٹ مانگتے رہے
عرب دنیا میں
الفاظ کو بھی پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے
میں
اپنے ملک میں داخلے کی اجازت کا
انتظار کرتا رہا
دیواروں پر ایسے اشتہار تلاش کرتا رہا
جو میرے وطن کی بات کریں
جو عوام کی بات کریں
لیکن مجھے
اپنے ملک کے دروازے پر
ایک ٹوٹے ہوئے گلاس کی طرح
دھتکار دیا گیا

نزار قبانی

(۱۹۳۲ء، ---)

آرام کی جگہ

رات کے پچھلے پہر
جب
آسمان ساری دنیا پر آرام و سکون کی شراب انڈیلتا ہے
ہر چیز بستر پر دراز ہو جاتی ہے
فوجی
آزادی کے خواب دیکھتے ہوئے
چاند
بادلوں کا تکیہ بنائے ہوئے
اور عاشق
اپنی محبوبہ کی آغوش میں
سو جاتا ہے
اس وقت میں
ایک شاعر
کہاں آرام پا سکتا ہوں؟

یوسف عبدالعزیز

پیغمبر

ایک دن
کوئی نہ کوئی تو
ہماری خوشخبریوں کا سراغ لائے گا
ہم
وہ پیغمبر ہیں جو
رات کی تاریک گلیوں میں کھو گئے
نجانے ہمارے الفاظ کا مستقبل کیا ہو گا
نجانے ہم کس عجائب گھر میں پائے جائیں گے
ہم وہ پیغمبر ہیں جو
زبان کے نام پر
تاریخ کے نام پر
اور
محبت کے نام پر
قتل کر دیے گئے

محمد الاسد

میں

میں
اپنی دھرتی کو
اپنی روح کا تسلسل
اپنے ہاتھوں کو
زخموں کی گزر گاہ
کنکروں کو
اڑتے ہوئے پر
پرندوں کو
بادام اور انجیریں
پسلیوں کو
درخت
کا نام دیتا ہوں

میں نرمی سے

اپنے سینے کے انجیر کے درخت کی ایک شاخ کھینچتا ہوں

اسے ایک پتھر کی طرح پھینکتا ہوں

جو حاکم کے ٹینک کو

بھک سے اڑا دیتا ہے

محمود درویش

(۱۹۴۲ء، ---)

موسیقار

ایک ویران گاؤں میں
ایک اداس شام
دو نیند سے بوجھل آنکھیں
تیس سال
پانچ جنگیں
ایک موسیقار
آگ اور اجنبی لوگوں کے گانے گاتا ہے
شام ڈھل چکی ہے
موسیقار سے لوگ پوچھتے ہیں
"تم ترانے کیوں گا رہے ہو؟"
وہ آہستہ سے جواب دیتا ہے
"میرا کام ہی ترانے گانا ہے"

ان لوگوں نے
موسیقار کی تلاشی لی
اس کے سینے میں اس کا دل
اس کے دل میں اس کے لوگ
اس کی آواز میں اس کا درد
اس کے درد میں اس کی جیل
اس کی جیل میں
ان لوگوں نے اپنے آپ کو
زنجیروں میں بندھا ہوا پایا

محمود درویش
(۱۹۴۲ء، ---)

سرحد کی دیوار

سورج سرحد عبور کرتا ہے
لیکن کوئی سپاہی اس پر گولی نہیں چلاتا
ایک کھویا ہوا گدھا سرحد پار کرتا ہے
لیکن کوئی اس پر حملہ نہیں کرتا
لیکن میں
اے میری دھرتی ماں
تمہارا بیٹا
تم سے جدا ہو چکا ہوں
میرے اور تمہارے درمیان
سرحد کی دیوار کھڑی ہے

سلیم جبران

(۱۹۴۱ء، ---)

اپنا وطن

آخری دن کے
آخری گھنٹے میں
قیدی نے جلاد سے
کھل کر بات کی
اپنے وطن کی جی بھر کر تعریف کی
وہ وطن
جو دنیا کا خوبصورت ترین وطن تھا
جلاد ہکا بکا رہ گیا
جونہی وہ ایک دفعہ مڑا
تو اس کی نگاہوں کے سامنے
تاریکیوں
خون
اور
زنجیروں کے علاوہ
کچھ نہ تھا

علی الخلیلی
(۱۹۴۴ء، ---)

بندوقیں

بندوقیں صبح سویرے چلتی ہیں
سارا شہر دھوئیں میں ڈوب جاتا ہے
بندوقیں صبح سویرے چلتی ہیں
پرندے ڈر جاتے ہیں
کیا ہوائی جہاز آ گئے ہیں؟
ایک خالی کمرے میں
پودے خاموش ہیں
گملے کانپ رہے ہیں

سعدی یوسف

(۱۹۳۴ء، ---)

جنگ کے بیٹے

اسے شادی کی رات
محاذ پر بھیج دیا گیا
وہ پانچ سال آزمائش کی زندگی گزارتا رہا
ایک دن جب وہ
سرخ سٹریچر پر لوٹا تو
اس کے تین بیٹے
ہوائی اڈے پر
اس کا انتظار کر رہے تھے

سمیح القاسم
(۱۹۳۹ء، ---)

ٹریفک کی بتیاں

سرخ بتی - رک جاؤ
سبز بتی - چل پڑو
سرخ بتی - سبز بتی
سرخ بتی - سبز بتی
رک جاؤ - رک جاؤ
چل پڑو - چل پڑو
سرخ بتی - سرخ بتی
سبز بتی کہاں ہے؟
کار میں ایک حاملہ عورت
بچے کو جنم دیتی ہے
بچہ جوان ہوتا ہے
عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے
کار میں شادی کی رسم ادا کرتا ہے
بچے پیدا کرتا ہے
اور کار میں
رسالے اور اخبار پڑھتا ہے

اسے کار میں بٹھا کر
محاذ پر لے جایا جاتا ہے
وہ کار کے شیشوں کے پیچھے
شہید ہو جاتا ہے
اسے کار کے پہیوں کے نیچے
دفن کر دیا جاتا ہے
وہ کار اب بھی گلی میں کھڑی
سبز بتی کے اشارے کی منتظر ہے
سرخ بتی - رک جاؤ
سبز بتی - چل پڑو
سرخ بتی - سبز بتی

معین بسیسی
(۱۹۲۶ء -- ۱۹۸۴ء)

رہائی

میرے قید خانے کے سارے محافظ
مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں
میری آزادی اور موت
آپس میں
بغلگیر ہو گئے ہیں

مرید بارغوتی

دیوار پر گھڑی

میرا شہر تباہ ہو گیا لیکن
دیوار پر گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی
میرے ہمسایوں کے گھر تباہ ہو گئے لیکن
دیوار پر گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی
میری گلی تباہ ہو گئی لیکن
دیوار پر گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی
میرا گھر تباہ ہو گیا لیکن
دیوار پر گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی
میری دیوار تباہ ہو گئی لیکن
گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی

سمیح القاسم
(۱۹۳۹ء، ---)

پسپائی کی کتاب کی نظمیں

دوستو!

پرانی دنیا مر چکی ہے

پرانی کتابیں دفنا دی گئی ہیں

ہماری باتیں

جن میں پرانے جوتوں کی طرح سوراخ ہو چکے ہیں

مردہ ہو چکی ہیں

وہ ذہن جو شکست تسلیم کر لیتا ہے

مر جاتا ہے

میرے مجروح ملک

تم نے

چند ہی لمحوں میں

مجھ جیسے شاعر کو
جو محبت کی نظمیں لکھا کرتا تھا
ایسے شاعر میں بدل دیا ہے
جو اب لکھنے کے لیے قلم کی بجائے
چاقو استعمال کرتا ہے

ہم نے
اپنے سروں پر
تہذیب و شرافت کا تاج پہن رکھا ہے
لیکن ہماری روحیں
اب بھی
پتھر کے زمانے میں رہتی ہیں

ہم ایسے انسان ہیں
جن کے
دل بے حس ہو چکے ہیں
اور روحیں خالی
ہماری زندگیاں

کالے جادو کی نظر ہو گئی ہیں

ہم، سارا دن

شطرنج کھیلنے

اور

خوابِ غفلت کے مزے لوٹنے میں گزار دیتے ہیں

کیا

ہم نے کبھی

اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ

کیا ہم ایسی قوم کے باشندے ہیں

جو

خدا کی برگزیدہ قوم کہلانے کا حق رکھتی ہو؟

نزار قابانی

(۱۹۳۲ء ۔ ---)

انجام

میری کہانی کا انجام
میز پر پڑے
باسی کھانے کی طرح
سرد ہو چکا ہے

عاصم محفوظ

(۱۹۳۵ء ---)

غدار

میرے وطن
میری دھرتی کو بیچنے والے
اتنے بے شرم ہیں کہ
شیطان کو بھی ان سے شرم آتی ہے
وہ قوم کی تباہیوں پر
اپنی امارت کی عمارت کھڑی کرتے ہیں
وہ قوم کی حفاظت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں
اپنے آپ کو حاکم اور محافظ قرار دیتے ہیں
لیکن
وہ خود ہی اس کی تباہی کے درپے ہیں
وہ اپنے وطن کی خرید و فروخت میں مبتلا ہیں
اخبار بھی ان کی طرفداری کرتے ہیں
لیکن ہم
حقیقت سے بخوبی واقف ہیں

ابراہیم توقان
(۱۹۰۵ء -- ۱۹۴۱ء)

مردہ شہادت

آخری کمانڈو کو کس نے قتل کیا تھا---؟
میں جانتا ہوں اسے کس نے قتل کیا تھا
میں جانتا ہوں
اس کی آنکھوں پر کس نے پٹی باندھی تھی
اس کے ہاتھ کس نے کاٹے تھے اور
جہاں پناہ!
اس کا خواب کس نے بارود سے اڑایا تھا
میں یہ سب کچھ جانتا ہوں کیونکہ
میں نے اس کا بچپن سے خیال رکھا تھا
اس نے ہمارے خوابوں میں جنم لیا تھا
اس نے شبخونوں کے سائے میں پرورش پائی تھی
اس نے دنیا سے محبت کی تھی
زمین کو اپنا خواب بنایا تھا
آہ! پھر وہ نوجوان
ایک چاقو کا نشانہ بن کر
خون میں لت پت ہو گیا تھا

جہاں پناہ!

میں جانتا ہوں
اس کمانڈر کو کس نے قتل کیا تھا
میں ہزاروں راتیں اس کے دروازے پر کھڑا رہا تھا
میں اس کے رتجگوں کا حصہ تھا
میں اس کی تلخ راتوں کا ہمسفر تھا
میں اس کی جلاوطنی کی
طویل رات کی روشن سحر کے
حسین خواب کا حصہ تھا
میں نے اس کی خون آلود جلد دیکھی تھی

میں جانتا ہوں
آخری کمانڈو کو کس نے قتل کیا تھا

میں جانتا ہوں
کہوں کس نے؟

اگر میں نے راز اگل دیا تو

جہاں پناہ!

میں آخری کمانڈر کی مردہ شہادت بن جاؤں گا

کہو کس نے؟

آپ نے اور میں نے

جہاں پناہ!

آپ نے اور میں نے

بلند الحیدری

(۱۹۲۶ء، ---)

ڈاکیے کا خوف

ساری دنیا کے قیدیو!
مجھے اپنا سب کچھ بھیج دو
اپنے خوف، چیخیں اور تنہائی کے سسکتے ہوئے دن
ساری دنیا کے مچھیرو!
مجھے اپنا سب کچھ بھیج دو
اپنے خالی جال اور سمندر کی بیماریاں
ساری دنیا کے کسانو!
مجھے اپنا سب کچھ بھیج دو
اپنے چیتھڑے، زخمی سینے، بھوکے پیٹ اور کٹے ہوئے ہاتھ
مجھے یہ سب کچھ
دنیا کے کسی بھی کیفے، کسی بھی گلی کے نام
بھیج دو

میں ایک طویل فائل تیار کر رہا ہوں
انسانی دکھوں کی فائل
جب وہ فائل تیار ہو جائے گی
اور اس پر
صدیوں کی منتظر آنکھیں
اور بھوکے لبوں سے
دستخط ہو جائیں گے
تو میں اپنی فائل
خدا کی خدمت میں پیدا کروں گا
لیکن
مجھے سب سے زیادہ اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں
خدا "ان پڑھ" نہ ہو

محمد المغوت

(۱۹۳۴ء، ---)

خلا میں ایک عرب سیاح

دنیا کی سائنس اور تکنالوجی کے ماہرو
مجھے خلاؤں کا ایک ٹکٹ دے دو
میں اپنے دکھی ملک کا نمائندہ ہوں
مجھے
میرے ملک کے
بوڑھوں، بیواؤں اور بچوں
پر ترس کھا کر
ٹکٹ دے دو
میری جیب میں کوئی رقم نہیں
صرف آنسو ہیں
میرے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے
میں وعدہ کرتا ہوں کہ

سفر کے دوران
کسی ستارے کو تکلیف نہں پہنچاؤں گا
کسی بادل سے تلخی سے پیش نہ آؤں گا
میں خلاؤں سے گزر کر
خدا تک پہنچنا چاہتا ہوں
تاکہ
خدا کے ہاتھ میں چابک دے سکوں
عین ممکن ہے کہ اس طرح ہم
انقلاب کی طرف مائل ہو سکیں

محمد المغوت

(۱۹۳۲ء، ---)

لفظ

لفظ
ایک اچھلتا ہوا گیند ہے
جسے حاکم
اپنی کھڑکی سے
باہر پھینک دیتا ہے
لوگ
اس گیند کے پیچھے
بھوکے کتوں کی طرح
زبانیں باہر نکالے
بھاگتے رہتے ہیں
ساتویں صدی سے
لفظ افیون بن چکا ہے

ایسا افیون جس سے
حاکم اپنی رعایا کو
بے حس کر دیتے ہیں
لفظ
ایسی طوائف ہے
جس کے ساتھ
ادیب، جرنلسٹ اور امام مسجد
سب ہمبستری کر چکے ہیں
اور وہ تھک چکی ہے

نزار قبانی

(۱۹۳۲ء، ---)

خواہش

وہ لوٹ کر نہیں آیا لیکن
اس کی چمڑے کی بیلٹ
دیوار پر لٹکتی رہتی ہے
وہ جو جوتے چھوڑ کر گیا ہے
اکڑ گئے ہیں
اس کی گرمیوں کی سفید قمیصیں
ابھی بھی الماری میں سو رہی ہیں
اس کے بکھرے ہوئے کاغذ
کہہ رہے ہیں کہ وہ جلد لوٹ کر نہ آئے گا
لیکن وہ پھر بھی اس کی منتظر رہتی ہے
اس کے چمڑے کی بیلٹ
اب بھی دیوار پر لٹکتی رہتی ہے
جب بھی شام ہوتی ہے
وہ اس کی ننگی کمر کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے
اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے

مرید برغوتی

(۱۹۴۴ء، ---)

یقین

وہ شام کو
آہستگی سے
پہلے دروازے
پھر کھڑکیاں بند کرتی ہے
پھر پردے کھینچتی ہے
ایش ٹرے خالی کرتی ہے
پھر آئینہ دیکھتی ہے
اور سرگوشی کے انداز میں کہتی ہے
"انہیں دیر ہو گئی انہیں دیر ہو گئی"
دیوار پر گھڑیال ٹک ٹک کرتا ہے
وہ آہستہ آہستہ
بستر کی طرف چل پڑتی ہے
شام کی سردی کی وجہ سے
وہ آہستہ سے کمبل اوڑھ لیتی ہے
لیکن
کمروں کی بجلیاں جلتی چھوڑ دیتی ہے

مرید برغوثی

(۱۹۴۴ء ۔۔۔)

سوائے

وہ سب آجاتے ہیں
دریا اور ریل گاڑی
آواز اور جہاز
بجلی اور خطوط
حوصلہ بڑھانے کے تار
جہاز اور دعوت نامے
وہ سب آجاتے ہیں
سوائے میرے قدم میرے ملک کی جانب

مرید برغوثی

(۱۹۴۴ء، ---)

محبت کی نظم

صبح سویرے
محبت کرنے والے کہاں چلے جاتے ہیں
وہ اپنے گانوں کو ایک جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں
وہ کسی پرسکون جگہ کی
وہ ایک دوستی کے ہاتھ کی
وہ اپنے خوابوں کے راستے کی
تلاش میں ہوتے ہیں
تلاش کرتے رہتے ہیں
لیکن کہیں نہیں پاتے

محمد القیسی

(۱۹۴۴ء، ---)

عظیم محبت

میں تمہیں کیسے دیکھنا سیکھوں
تم میرے اندر بستے ہو
میں تمہیں کیسے گلے لگاؤں
میں تمہارے اندر رہتا ہوں
میں تمہارے دکھوں کو کیسے خوشیوں میں تبدیل کر دوں
تم میرے ہاتھ کو تھام لو
جو تمہاری طرف ایک دریا کی طرح بڑھ رہا ہے
عظیم محبت ایک مقدس لفظ ہے

سمیح القاسم
(۱۹۳۹ء، ---)

دعا

پتھر باتیں کرتا ہے
پتھر روٹی بن جاتا ہے، شراب بن جاتا ہے
پتھر آسمان ہے
خوش قسمت ہے وہ شخص جو پر لگا کر اڑ سکتا ہے
آہ! اے محبوب
میں آج رات تمہیں کتنا چاہتا ہوں
میں نے پہلی دفعہ تمہیں گلے لگایا ہے
میں پہلی دفعہ تمہارے اندر بے لباس ہو گیا ہوں
میں پہلی دفعہ پتھر بن گیا ہوں۔ آسمان میں ڈھل گیا ہوں
تمہارا جسم اس بچے کی طرح ہے جو پانی میں تیر رہا ہو
میں بچے اور پانی سے محبت کرتا ہوں

ویرانے میں صرف پتھر ہی دوست بنتا ہے
اس کے کھردرے پن کے باوجود
انسان اس پر تکیہ کرتا ہے
آؤ! ہم اس لمحے کو اپنالیں
پتھر آسمان بن جائے
اور ہم پر لگا کر اڑ جائیں

یوسف الخال

(۱۹۱۷ء، ---)

مختصر تقریر کے لیے معذرت

خواتین و حضرات!
میری تقریر بہت مختصر ہو گی
میں اپنا وقت الفاظ پر ضائع نہیں کرنا چاہتا
میری زبان
لکڑی کی تلوار نہیں ہے
میرے الفاظ سنہری ہیں
میرے الفاظ انگوروں کے خوشے ہیں
میں بہک نہیں گیا
میں صرف تھکا ہوا ہوں
موم بتیاں بجھ رہی ہیں
رات سرد ہو رہی ہے
میں اپنا دل اپنے بریف کیس میں لیے لیے پھرتا ہوں

ایک مردہ بچے کی طرح
میں نے ہزاروں بے وفائیاں اور جھوٹ
برداشت کیے ہیں
خواتین و حضرات!
میری تقریر مختصر ہو گی
میں بہک نہیں گیا
میں بس دکھی ہوں
میں سیرز نہیں ہوں لیکن
روم جل رہا ہے
میری روح کا
ہزاروں بے وفائیوں اور جھوٹی باتوں سے
دم گھٹنے لگا ہے
خواتین و حضرات!
خدا حافظ

عبدالوہاب البیاتی

(۱۹۲۶ء، ---)

لڑکی - تتلی - لڑکی

ایک لڑکی نے خواب دیکھا کہ
وہ تتلی بن گئی ہے
وہ جب جاگی
تو نہ جان سکی
کہ وہ ایک لڑکی تھی، جو خواب میں تتلی بن گئی تھی
یا ایک تتلی تھی جو خواب میں لڑکی بن گئی تھی

صدیوں بعد
میرے بچوں نے بھی خواب دیکھا کہ
وہ تتلیاں بن گئے ہیں
صبح اٹھ کر وہ بھی نہ جان سکے کہ
وہ بچے تھے جو خواب میں تتلیاں بن گئے تھے یا
تتلیاں تھے جو خواب میں بچے بن گئے تھے

کل رات
دیر تک
اتنی تیز ہوا چلتی رہی کہ
ایک تتلی
اور
میرے بچے
ریزہ ریزہ ہو گئے

انسی الحاج
(۱۹۳۷ء، ---)

معذور

میری محبوب!
یہاں کی رات معذور ہے
موت معذور ہے
اور خدا
خدا بھی معذور ہے
اور تم میری زندگی کی کہانی سننا چاہتی ہو
میری کوئی زندگی نہیں
کیونکہ میں
ایک معذور رات کو
ایک معذور خیمے میں
ایک معذور لمحے میں پیدا ہوا تھا

پھر میں
ایک معذور خاندان میں پلا بڑھا
اور میں نے
ایک معذور معاشرے میں پرورش پائی
اسی لیے تم -- میری محبوب
مجھے معذور پاتی ہو

عبداللہ رضوان

(۱۹۴۹ء، ---)

میری کل کائنات

میں نے
اپنے کندھوں پر کبھی بندوق نہیں اٹھائی
لبلبی نہیں دبائی
میری کل کائنات
ایک بانسری ہے
جو آزادی کے گیت گاتی ہے
میری کل کائنات
ایک برش اور سیاہی ہے
جن سے میں
اپنے خوابوں کی تصویریں بناتا ہوں
میری کل کائنات
میرا کامل ایمان
اور اپنے لوگوں سے محبت ہے
وہ لوگ
جو بہت دکھی ہیں

توفیق زیاد

(۱۹۳۲ء، ---)

فلسطین! تم سب کچھ ہو

میں نے تمہاری ذات میں
ایک ماں، ایک بہن، ایک بیوی، ایک خاندان
سب دیکھے ہیں
تمہارے ہونٹوں پر
میرے قبیلے کی محبت بھری باتیں تھیں
اور اس دل کی کہانی تھی
جو برسوں سے مر چکا ہے
لیکن اب بھی
تمہارے بازوؤں میں
ایک نوزائدہ بچے کی طرح پل بڑھ رہا ہے

عبداللہ رضوان

میرے لیے کافی ہے

میرے لیے کافی ہے کہ میں
اپنی دھرتی پر مروں
اس میں دفن ہو کر
اس کی مٹی میں گم ہو جاؤں
پھر ایک پھول بن کر ابھروں
اور میرے وطن کے بچے مجھ سے کھیلیں
میرے لیے کافی ہے کہ میں
اپنی دھرتی کے سینے سے لگا رہوں
چاہے میری قسمت میں گھاس بننا ہو
یا پھول

فدوا توقان

(۱۹۱۷ء، ---)

پیش گوئی

اے قوم کے بزرگو
بچوں کو بہت سا دودھ پلاؤ
ان کے لیے روشنی کا انتظام کرو
ان کے لیے
ماچس کی تیلیاں
لالٹین
تیل
سب کچھ بچا کر رکھو
کیونکہ
ہماری قسمت کی رات کافی لمبی ہو گی

مرید برغوتی

(۱۹۴۴ء، ---)

سچ کے محافظ

ہماری زمین جلادو
ہمارے خواب جلادو
ہمارے گالوں پر تیزاب پھینک دو
ہمارے شہیدوں کے خون پر مٹی پھینک دو
ہمارے قیدیوں کی چیخوں کو
اپنی مشینوں کے شور میں گم کر دو
ہماری دھرتی کو تباہ کر دو
ہمارے کھیتوں کو تاخت و تاراج کر دو
ہمارے بزرگوں کا بنایا ہوا
ہر شہر، ہر قصبہ
ہر گھر، ہر درخت
ہر کتاب، ہر قانون
بموں سے مسمار کر دو
تم
ہمارے ماضی
ہمارے ادب

ہمارے استعاروں
کو نیست و نابود کر دو
تم یہ سب کچھ کر لو
اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ جی چاہے تباہ کر دو
مجھے تمہارے ظلم کی کوئی پرواہ نہیں
کیونکہ
میں نے ایک بیج بچا کر رکھا ہے
وہ بیج ایسے درخت کا ہے
جو میرے آبا و اجداد سے
نسل در نسل
منتقل ہوتا چلا آیا ہے
اور وہ بیج ایک دن
میں اپنے وطن کی دھرتی میں بوؤں گا

فوامن ترکی

(۱۹۴۰ء، ---)

دسواں باب
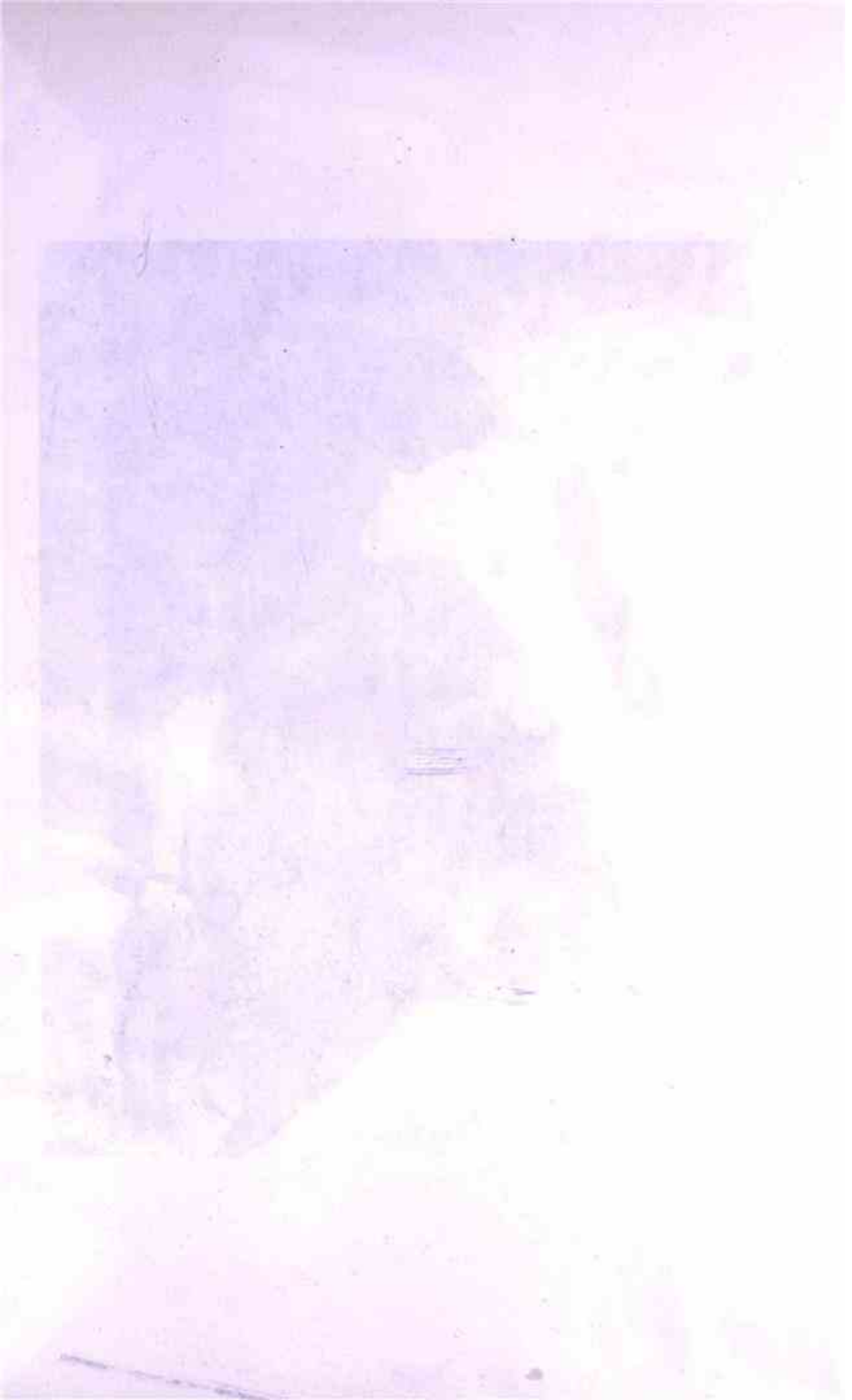
نئی شاخ زیتون کی

جاوید دانش

کردار:

ابوالعبد : ایک فلسطینی۔۔۔ "انتفادہ کا رکن"

نہال : العبد کا چھوٹا بھائی، "امن کا حامی"

روتھ : ایک حساس یہودی نرس

سِمون گولڈ : روتھ کا بھائی، "دایاں بازو کا لیڈر"

حسن سرور : بوڑھا فلسطینی، نیم پاگل!

زمانہ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء

اسٹیج پر مدھم روشنی میں پانچ کیوب (Cube) رکھے ہیں، پانچ مختلف اسپاٹ لائٹ ان کیوب پر روشن ہیں، ہر کردار ان کیوب کو حسبِ ضرورت کبھی کرسی، کبھی محاذ اور کبھی ممبر وغیرہ کے طور پر استعمال کرتا ہے! ساتھ ہی حسبِ ضرورت مائم (Mime) یا دانس فورم میں تنہا یا گروپ کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔ اسٹیج کے سامنے دائیں اور بائیں طرف دو کیوب رکھے ہیں ایک طرف نہال اور دوسری طرف روتھ بیٹھی ہے--- اس سے کچھ پیچھے دو کیوب پر ایک طرف سمون اور دوسری جانب العبد بیٹھا ہے اور پیچھے کی طرف بیچ میں ایک خالی کیوب رکھا ہے---- یہ حسن سرور کی نشست ہے!

پردہ کھلنے پر چاروں کردار خاموش اور ساکت اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں، پس منظر سے ہجوم کے چیخ و پکار کی آوازیں، کبھی خوشی کبھی غصے کا تاثر، ہوائی فائر---- دف بجنے کی آواز---- ساری ملی جلی آوازیں دبی دبی آ رہی ہیں!

حسن سرور ایک ہاتھ میں زیتون کی ایک شاخ، ساتھ ہی گلے اور جسم پر فلسطینی اور اسرائیلی پرچم کی کاغذی جھنڈیاں لپیٹے تیزی سے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے، وہ خوش نظر آ رہا ہے مگر کچھ گھبرایا سا بھی لگتا ہے اور ادھر ادھر دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اچانک ساری آوازیں بند ہو جاتی ہیں---- ایک فائر، پھر پکڑو پکڑو کی آواز آتی ہے، سرور اپنے کیوب کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہے اور دبک کر بیٹھ جاتا ہے، لمحہ بھر بعد پس منظر سے وائلن کی پُرسوز موسیقی ابھرتی ہے!

العبد : (اپنی جگہ بیٹھے ہوئے، خود کلامی) تیس سال پورے تیس سال، ہو گئے ہیں اس آگ میں جل رہا ہوں---- میں صرف پانچ سال کا تھا، ابھی صبح اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بمباری شروع ہو گئی اور پھر دیکھتے دیکھتے ان کے بھیڑیے ہمارے گھر میں گھس آئے، میری نظروں کے سامنے میری ماں کی آبروریزی ہوئی اور میرے باپ کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا، پتہ نہیں ہم دو بھائی اور ایک بلکتی بہن کو کیسے اور کیوں چھوڑ دیا گیا! آج تک میں ماں کی بے بس چیخیں اور باپ کا تڑپ تڑپ کر مرنا نہیں بھولا---- لوگ کہتے ہیں: بھول جاؤ---- کیسے بھول جاؤں! میں کچھ بھی بھولنا نہیں چاہتا---- سب مفاد پرست ہیں، میں کسی کو نہیں مانتا---- میں کسی کو معاف نہیں کروں گا، کسی کو بھی نہیں----

سِمون : (خود کلامی) یہ بنی اسرائیل کی ارضِ معود ہے! اس کی حفاظت ہمارا فرض، بلکہ ایمان ہے---- ہم نے بہت دربدری کر لی---- میرے پورے خاندان کو صرف اس لئے ختم کر دیا گیا کہ وہ یہودی تھے، اس سانحے کو بیس برس ہونے کو آئے مگر ہر بات مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کوئی دس سال کا تھا اور روتھ چھ سال کی، ہم اپنے چاچا کے ساتھ تھے اس لئے بچ گئے، ہمیں اپنے والدین کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا، چاچا فرار ہوئے تو ہم لوگوں کو بھی ساتھ لے لیا---- (وقفہ)

آج کے لیڈر کہتے ہیں ماضی کی بات نہ کرو! ماضی کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے، میں جان دے دوں گا مگر کسی طرح کی مصالحت نہیں کر سکتا---- میں کسی سے کسی طرح کی صفائی نہیں چاہتا---- ہم جو کچھ کر

رہے، ہیں قدرت کو یہی منظور ہے!

روتھ: (خود کلامی) مجھے ماں باپ کی شبیہہ تو یاد ہے مگر ان کا بچھڑنا یاد نہیں---- ہاں یہ یاد آتا ہے کہ بچپن میں ہمیں عرب بچوں سے بات کرنے کو منع کیا جاتا تھا! میں آج تک یہ نہ سمجھ سکی کہ بڑوں کی نفرتیں اور نسلوں کا زہر بچوں میں کیوں پھیلایا جاتا ہے!

میں بچپن سے اپنے بھائیوں بلکہ سبھوں سے الگ تھی، میرے دل میں کسی کے لئے کسی طرح کی نفرت نہیں---- شاید اسی لئے میں نرس بن گئی، دکھی انسانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھالیا میں نے---- اے خدا تو لوگوں کے دلوں کے دروازے بند کیوں کر دیتا ہے، اس سرزمین پر تو نے اتنے انبیاء اولیاء بھیجے مگر یہاں اب تک سکون کیوں نہیں، لوگوں میں قناعت کیوں نہیں ہے---- (وقفہ) گر تو ان سبھوں سے ناراض ہے تو مجھ پر رحم کر---- میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں---- صرف میں نہیں، نہال بھی خود کو بہت مجبور پاتا ہے---- ہم کیا کریں----!

نہال: (خود کلامی) ہاں، میرے بزرگوں سے ان کی زمینیں چھین لی گئیں---- ان بے گناہوں کا قتل عام بھی ہوا---- میرے سر سے بھی والدین کا سایہ چھین لیا گیا---- مگر قتل و غارت گری کی جو چکی برسوں برس سے گھوم رہی ہے، اس کی انتہا کیا ہے؟ نفرت کی یہ آندھی رکتی کیوں نہیں---- یہ تھکتی کیوں نہیں---- خون کی پیاس بجھتی کیوں نہیں---- آخر کب تک---- کب تک ہم ایک دوسرے کو

مارتے رہیں گے---- کب تک؟

سرور: (خود کلامی) مجھ کچھ نہیں معلوم---- کچھ ہو تو یاد آئے! (آنکھیں بند کرتے ہوئے) نیند---- نیند آ رہی ہے---- سونے دو----

(پس منظر سے کوڑا مارنے کی آواز آتی ہے، چونک کر آنکھیں کھول دیتا ہے)

اف! (درد سے کراہتا ہے) آغیسر مجھے کچھ نہیں معلوم---- میں نے کہہ دیا میرا کوئی گروپ نہیں، کسی پارٹی سے میرا تعلق نہیں! (کوڑے کی آواز) میں نے ہزار بار کہہ دیا---- میں جھوٹ نہیں بول رہا (اذیت سے چیختا ہے) مجھے جان سے مار ڈالو---- پھر بھی کہوں گا---- میں----- حسن سرور---- سکونٹ، ڈیوڈ کیمپ---- قصور کچھ نہیں--- نہیں میرے کوئی بیٹے نہیں ہیں---- آہ---- (لمبی لمبی سانسیں لیتا ہے)(وقفہ)

ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے آگے پیچھے دیکھتا ہے اور سرگوشی کرتا ہے)

چلے گئے کمبخت---- (ہنستا ہے) بہت سخت جان ہوں میں----- سب کچھ یاد ہے مجھے---- سب باتیں نقش ہیں دل و دماغ پر---- مگر کسی کو نہیں بتاؤں گا، جتنی بار زبان کھلے گی---- اتنا خون خرابا ہو گا--- اب میری زبان کوئی نہیں کھلوا سکتا (سبھوں کو گھورتے ہوئے) مجھے پاگل سمجھتے ہو تم لوگ (سب ڈر کر اپنی جگہ سمٹنے لگتے ہیں) (ہنستا ہے) میں نہیں تم سب پاگل ہو---- پاگل ہو تم سب----- (ہنستا ہے) یہ پاگلوں کی جنت ہے یہ---- (سب ماتم میں پاگلوں کی حرکت کرنے لگتے ہیں) "A Promissed Land of Lunatics" (ہنستے ہنستے خاموش ہو جاتا ہے) میں نے بھی ہوش سنبھالتے ہی ہتھیار اٹھا لیا تھا---- چھ سال

کی عمر میں پہلا پتھر مارا تھا ایک مغرور فوجی کو (سب مائم میں ایک دوسرے پر پتھر پھینکنے لگتے ہیں) بس رات دن ایک لگن تھی کہ لڑنا ہے---- آزاد کرانا ہے یا قربان ہو جانا ہے، مگر جلد احساس ہوا یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی (ہر کوئی اپنے اپنے کیوب کا سہارا لے کر ایک دوسرے پر فائر کرتا ہے) لڑتے لڑتے میرے بیٹے جوان ہو گئے--- تلے اوپر چار---- خوبرو جوان---- وہ بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے---- میں تھکتا نہیں، میں نے ہمت بھی نہ ہاری تھی کہ ایک دن ایک اسرائیلی بم نے میرے بچوں کی جیپ اڑا دی---- (وقفہ) میرے آنگن میں شام کے ساتھ چار کٹے پھٹے جنازے اترے---- اس روز میرے کاندھے شل ہو گئے، اس غم کو میری بیوی برداشت نہ کر سکی اور میں تنہا بالکل تنہا ہو گیا (اٹھتا ہے اور فضا میں گھورتا ہے) (سب مائم میں فضا کو گھورتے ہیں) تنہا---- بالکل تنہا کبوتر امن کا کبوتر اڑ گیا---- (سب مائم میں کبوتر کی طرح اڑتے ہیں) (ہنستا ہے) پکڑو جانے نہ پائے--- کہ یما--- گرفتار! امن کا کبوتر زخمی ہے---- ہاہاہا---- زخمی ہے---- ہاہاہا!
(زمین پر گر کر) میرے بچے بھی زخمی ہیں (سب زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں)
پانی---- کوئی پانی لاؤ---- نہیں تم لوگ مجھے تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے---- شوٹ---- پکڑ لو---- جانے نہ پائے! (پس منظر سے ہجوم کی چیخ و پکار--- شور، ہوائی فائر--- دف بجنے کی آواز، ہنسی---- خوشی کا تاثر)

سرور: (اٹھتا ہے اور گلا صاف کرتے ہوئے، اپنے کیوب پر چڑھ جاتا ہے اور سامعین سے مخاطب

ہوتا ہے) لیڈیز اینڈ جنٹلمین ---- میں یٹزاک زبین ★---- آج ۱۲ ستمبر ۱۹۹۳ء کو اپنے تیس سال پرانے دشمن "PLO" کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں اور امن کا پیغام لے کر آیا ہوں (پس منظر سے جوش و خروش کی آوازیں لگ سہال اور روتھ خوش ہو کر تالی بجاتے ہیں مگر سمون اور العبد غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں) آج وقت اور عالمی سیاست کا تقاضہ ہے کہ ہم لوگ اپنی پرانی دشمنی کو بھول کر اپنے مقاصد کو بدلیں! اپنا وقت، دولت اور توانائی، اپنی سرحدوں کی حفاظت کی بجائے عوام کی معاشی، معاشرتی اور سائنسی ترقی پر خرچ کریں تاکہ اسرائیلی عوام تحفظ کے ساتھ ساتھ خوشحال اور پرامن زندگی گزار سکیں لگ (وقفہ) آج کا دن ایک تاریخی دن ہے لگ اور یہ امن کا معاہدہ انہیں مقاصد کی طرف پہلا قدم ہے لگ شکریہ!

سمون: (غصہ میں) لوگو یہ ہمارا لیڈر نہیں ---- غدار ہے! یہ ہمارے سروں پر فلسطینیوں کو مسلط کر دینا چاہتا ہے ---- ایجنٹ ہے یہ ۸۱۸ کا ---- بکواس کرتا ہے! امن کے من گھڑت قصے پر کبھی یقین نہ کرنا ---- ہم کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، فیصلہ سرحد پر ہو گا!

(سارے کردار ہاتھ لہرا لہرا کر مائم میں اپنے غصے کا اظہار کرتے ہیں)

سرور: (اونچی آواز میں) دوستو! میں یاسر عرفات، آج امن کا پیغام لے کر آیا ہے! بھائیوں مجھے آپ سب کے مدد کی ضرورت ہے! آج امن صرف فلسطین کی ضرورت نہیں ----! یہ روس، امریکہ اور عرب ممالک کی بھی ضرورت ہے، مجھے اندازہ ہے ہمارے کچھ ساتھی اس معاہدے سے

★ - ٹائم میگزین کے انٹرویو سے دونوں کا اقتباس۔

ناخوش ہیں (پس منظر سے ناگوار آوازیں، ساتھ ہی العبد اور سمون غصہ کا اظہار کرتے ہیں) مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جنگ شروع کرنا آسان ہے، لیکن امن قائم کرنا بہت مشکل ہے---- آج ہمارے چاروں طرف ایک نئی دنیا معرضِ وجود میں آرہی ہے اور ہم فلسطینی اور عرب اس نئی دنیا کی تشکیل میں حصہ لینا چاہتے ہیں---- شکریہ! (خاموشی سے اپنے کیوب پر بیٹھ جاتا ہے)

(نہال اور روتھ خوش ہو کر تالی بجاتے ہیں)

العبد: (غصے میں) ہمیں پتہ، معلوم تھا، تم ہمارے خوابوں کو نیلام کر دو گے۔ جھوٹے---- دھوکے باز---- (عوام سے مخاطب ہو کر) یہ بھی یہودیوں سے مل گیا ہے! کیسا امن----؟ سب جھوٹ ہے، تم ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے---- یہاں امن صرف اس وقت ہو گا، جب اسرائیلی ہماری زمین چھوڑیں گے---- اور یہ "PLO" کے بس کی بات نہیں---- امن کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، وہ انتفادہ کے کارکن ادا کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے!

(پس منظر سے خوشی اور غصے کی ملی جلی آوازیں آ رہی ہیں)

روتھ: (اپنے کیوب سے اٹھ کر بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتی ہے، جیسے کسی کا انتظار ہو---- زیرِ لب دعا مانگتی ہے) اے خدا---- میرے نہال کی حفاظت [illegible] آنکھیں بند کر لیتی ہے)

نہال: (اپنے کیوب سے اٹھ کر روتھ کی طرف بڑھتا ہے) روتھ کچھ سنا تم نے----! (روتھ آگے بڑھ کر بغلگیر ہوتی ہے)

روتھ: ہاں---- سنا---- !مگر کچھ یقین نہیں آ رہا ہے!

نہال: (خوش ہو کر) یہ حقیقت ہے روتھ---- آخر ان لوگوں کو عقل آ ہی گئی---- اب سب کچھ نارمل ہو جائے گا---- تم نہ کہتی تھیں---- "پتہ نہیں اس ملک میں بچوں کو ان کا بچپن کبھی واپس ملے گا؟"---- اب اس ملک کے بچے ایک بار پھر بے خوف و خطر گلیوں میں کھیلیں گے، مسکرائیں گے۔ اب ہم لوگ بھی بلا جھجک ملیں گے---- اور----

روتھ: (بات کاٹتے ہوئے) مگر مجھے آج بہت ڈر لگ رہا ہے، (کچھ سوچتے ہوئے) بالکل پہلے دن کی طرح جب تم زخمی ہو کر میرے وارڈ میں داخل ہوئے تھے---- (وقفہ) اور میں پتہ نہیں کیوں---- پہلی نظر میں تمہیں دل دے بیٹھی تھی!

نہال: (فضا کو گھورتے ہوئے) ہاں---- تمہاری مہربان نظروں نے مرہم کا کام کیا تھا، مگر پہلے پہل مجھے یقین نہ آیا کہ ایک----

روتھ: (مسکراتے ہوئے) یہودی!

نہال: (سنبھلتے ہوئے) ہاں---- تم لوگوں میں سے کوئی مجھ پر مہربان ہو سکتا ہے!

روتھ: (جلدی) میں تو تم پر ہمیشہ مہربان رہی ہوں جانم---- مگر ان لوگوں کا کیا کروں---- تم میرے بھائی کو نہیں جانتے؟

نہال: (مسکرا کر) تم بھی میرے بھائی کو نہیں جانتیں---- (روتھ کو قریب کرتے ہوئے) مگر اب ہمیں کوئی بھی نہیں روک سکتا (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر)

محبت سچی ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے---- آؤ آج کی خوشی کو یادگار بنالیں (یہ لوگ بڑھ کر سرور کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور سب ہاتھ پکڑ کر گول گول گھوم کر ناچتے ہیں)

(پس منظر سے خوشی کی موسیقی سنائی دے رہی ہے! اچانک روتھ ہاتھ چھڑا کر بیٹھ جاتی ہے)

نہال: (حیرت سے) کیا بات ہے روتھ---- تمہیں تو خوش ہونا چاہیے!

روتھ: (مضطرب ہو کر) پتہ نہیں کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ چلو نہال ہم لوگ یہاں سے کہیں دور نکل جائیں---- جہاں نہ کوئی عرب ہو نہ کوئی اسرائیلی!

نہال: اب جب سب ٹھیک ہونے جا رہا ہے تو ہم جائیں گے کہاں؟ ہم اپنی مٹی چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے---- ہم یہیں اپنا گھر بسائیں گے---- وہ بھی تمہارے ساتھ!

روتھ: یہ یہاں رہ کر کبھی ممکن نہ ہو گا---- میرا بھائی----

سِمون: (اپنے کیوب سے فوراً اٹھتا ہے اور بات کاٹتے ہوئے) روتھ! (ناگواری کے ساتھ) تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ شہر میں آج کچھ بھی ہو سکتا ہے---- اور یہ تم بات کس سے کر رہی ہو؟

روتھ: (سنبھلتے ہوئے) ارے بھائی تم---- کچھ سنا تم نے؟ امن کا اعلان ہو گیا---- تمہارے بچے اب سکون سے اسکول جائیں گے---- تمہیں اب کوئی فکر نہ ہو گی---- تم بھی اب سکون کا سانس لو! کب تک بندوق اٹھائے پھرتے رہو گے؟

سِمون: تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا---- کون ہے یہ عرب؟

روتھ: اوہ---- یہ---- یہ میرا دوست نہال ہے!

سمون: (غصہ میں) ایک عرب اور تمہارا دوست--- یہ کبھی نہیں ہو سکتا!

نہال: یہ ہو چکا ہے سمون صاحب---- روتھ اور میں----

العبد: (اپنے کیوب سے اٹھ کر) نہال! آج شہر میں تناؤ ہے اور تم اس علاقے میں---- یہ لڑکی کون ہے تمہارے ساتھ؟

نہال: بھائی---- یہ میری دوست ہے روتھ!

العبد: تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا---- ایک اسرائیلی اور تمہاری دوست---- یہ کیسے ممکن ہے؟

سمون: (روتھ سے) دیکھا روتھ! ابھی مکمل امن ہوا نہیں---- انہیں کسی طرح کے حقوق بھی حاصل نہیں ہوئے---- مگر ان کے تیور دیکھو---- تم سمجھتی ہو--- ایسے لوگوں سے ہمارا نباہ ممکن ہے!

روتھ: کیوں نہیں----! یہ آپ دونوں پر منحصر ہے! امن کے معاہدے اور اس کا احترام جانبین کریں تو ہر ایک کا نباہ ہر کسی سے ممکن ہے!

العبد: مگر ہم نباہ کریں کیوں؟ اور پھر امن کیسا---- بہت جلد ہم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے---- ہماری قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی!

سرور: (بیچ میں آ کر) میں کون مجھے یاد نہیں---- مگر تمہارے مسئلے کا حل ضرور نکال سکتا ہوں! جس امن کی فاختہ کو تم لوگوں نے اپنے شور سے اڑا دیا ہے، میں بھی اسی کی تلاش میں ہوں (روتھ کو دیکھ کر) بولو بیٹی تم کیا چاہتی ہو؟

سمون: اے عرب---- میری بہن کا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ قسم داؤد کی تمہیں میں

شوٹ کر دوں گا!

العبد: (سمون کو نشانہ بنا کر) اس پاک مٹی کی قسم---- اگر تم نے ایک لفظ بھی میرے بھائی کے خلاف کہا تو میں تم دونوں کو بھون کے رکھ دوں گا!

روتھ: (روتے ہوئے) خدا کے لئے آپ دونوں یہاں سے چلے جائیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں (نہال کے گلے لگ جاتی ہے)

سرور: (دونوں سے) آج تک تم دونوں نے خون خرابہ کے علاوہ کچھ اور کیا ہے؟ کیوں ان معصوموں کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا رہے ہو! ان کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے تو انہیں تنہا خوش ہو لینے دو!

سیمون: بوڑھے بکواس بند کرو---- ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا!

سرور: مجھے کیا مارو گے---- مجھے مرے تو آج تیس سال ہونے کو آئے---- ہا ہا ہا---- آج میں دوبارہ جنم لے رہا ہوں آج ان بچوں کو بھی نئی زندگی ملے گی!

العبد: (نہال سے) مجھے تم نے بہت مایوس کیا ہے! ایک یہودی لڑکی کے لئے تم اپنا مشن بھلا بیٹھے؟ تم بھول رہے ہو کہ انتفادہ کے رکن ہو تم!

نہال: اپنی مرضی سے نہیں---- کالج سے فارغ ہو کر جب نوکری نہ ملی تو تم نے زبردستی مجھے گوریلا بنا دیا---- مگر روتھ کی محبت نے مجھے نئی زندگی، نیا شعور بخشا ہے---- میں اب ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا---- اور پھر، آج کا اعلان مجھے----

العبد: (بات کاٹتے ہوئے) سب بکواس ہے---- ان کے کہنے سے امن تھوڑا ہی ہو جائے گا! ابھی ہماری بندوقوں میں بہت کارتوس باقی ہیں---- امن کا

فیصلہ ہم کریں گے!

سرور: (فضا کو گھورتے ہوئے) تو بھی خاموش بیٹھا ہے! ابراہیم کی یہ کیسی اولادیں ہیں، ان کا دل تو بدل کیوں نہیں دیتا؟

سمون: (بیزار ہو کر) میں سوچ بھی نہیں سکتا---- میری بہن میرے دشمن کی باہوں میں پناہ ڈھونڈے گی---- اس سے تو اچھا ہوتا، تُو کسی عرب کی گولی کا نشانہ بن جاتی!

روتھ: (سمجھاتے ہوئے) اس نفرت نے سوائے پریشانی اور غم کے تمہیں دیا کیا بھائی---- محبت میں بڑی قوت ہے---- بہت ٹھنڈک! آج میں سکون سے نہال کے ساتھ مرنے کو تیار ہوں!

سرور: اب کوئی کسی کی جان لینے کی بات نہیں کرے گا---- آج تاریخ ایک نیا باب رقم کر رہی ہے---- اب ہمیں اپنے بچوں کے لئے نفرت کی جگہ محبت کے گیت گانے ہوں گے---- آپس میں صلح و بھائی چارگی سے ہی اس قوم کو کامیابی حاصل ہو گی! اس کی بنیاد ان بچوں کی شادی سے رکھی جائے گی!

سمون: (ہوا میں فائر کرتا ہے) پاگل بوڑھے---- خاموش! روتھ---- اگر تم اس لڑکے اور بوڑھے کی زندگی چاہتی ہو تو فوراً میری طرف آؤ---- ورنہ---- اس خون کی ذمہ دار تم ہو گی!

(روتھ ہڑبڑا کر نہال کا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے)

العبد: (جوابی فائر ہوا میں کرتا ہے) تمہاری دھمکیوں سے ہم ڈرنے والے نہیں! میرے بھائی کو کچھ ہوا تو کوئی بھی یہاں سے زندہ نہیں جائے گا!

(سرور لپک کر سامنے آتا ہے نہال اور روتھ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے گگ سمون روتھ کو اپنی طرف اور العبد نہال کو اپنی طرف گھسیٹتے ہیں اور اسی میں گولی چلتی ہے اور سرور کو زخمی کر دیتی ہے گگ سرور زمین پر گرتا ہے اور سب اپنی اپنی جگہ فریز ہو جاتے ہیں)

سرور: (نڈھال ہو کر زمین سے زیتون کی شاخ اٹھاتے ہوئے) بچو یہ نئی شاخ ہے زیتون کی کونپلیں بہت نازک ہیں ---- اس کی حفاظت کرنا! (ڈھیر ہو جاتا ہے)

(پس منظر سے وائلن کی پر سوز موسیقی ابھرتی ہے اور ایک نظم فضا میں تحلیل ہوتی سنائی دیتی ہے۔)

"نرم و نازک حسین
ایک ننھا شجر
اپنے اندر چھپائے ہوئے
برگ و بر ----
لمحہ لمحہ
جواں ہو رہا ہے
مگر
کیا خبر
سر پہ بجلی کے تاروں کا ہے سلسلہ!!!

שלום
SHALOM
السلام

گیارھواں باب
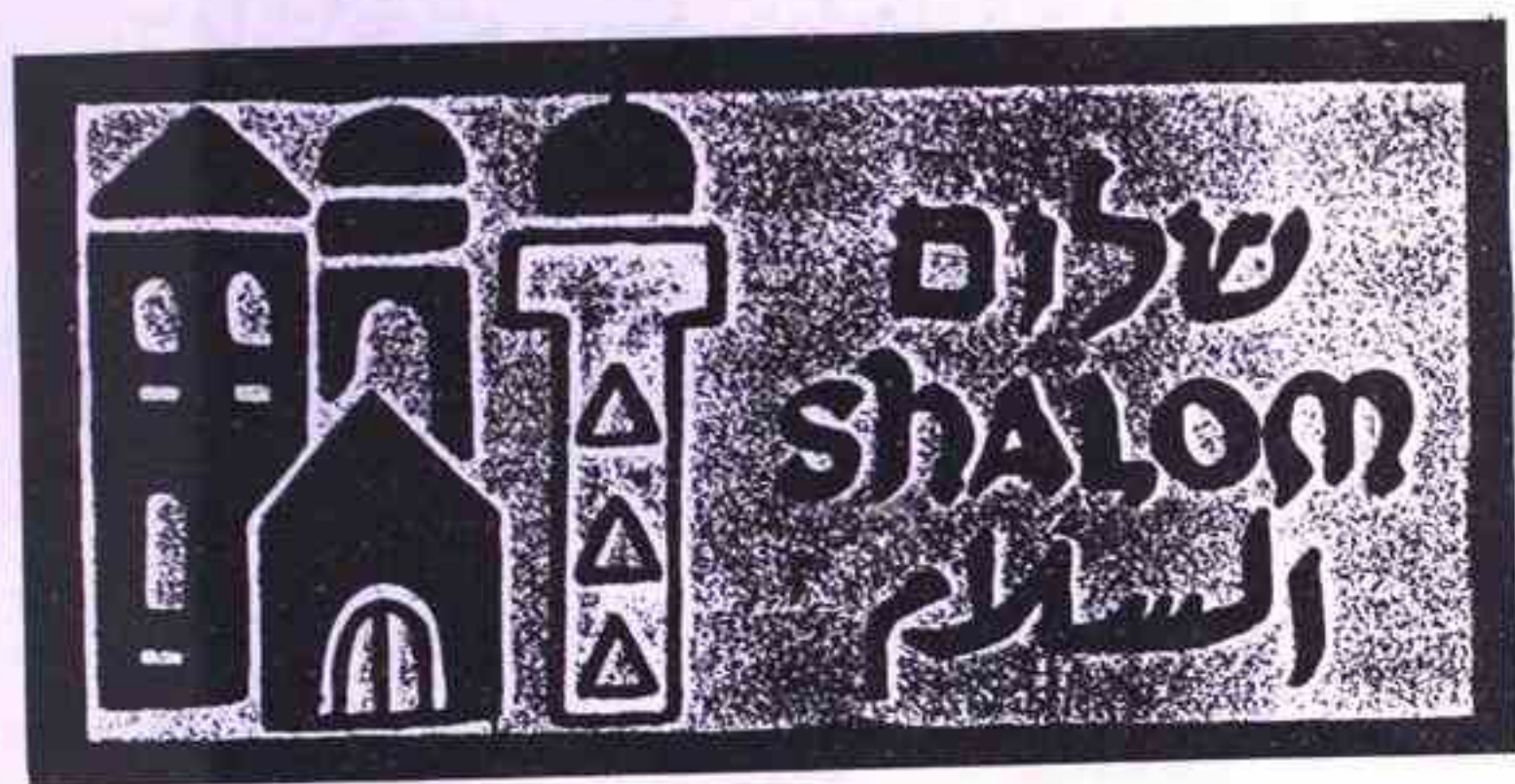
نثری تخلیقات کے تراجم

"برزخ کا سفر"----!

(اسرائیلی جیل میں ایک فلسطینی کی ڈائری)

صلح تماری

۱۹۴۲ء

تم اپنا بستہ اتار سکتے ہو، وارڈن نے حکم دیا!

میرے سر سے تقریباً چپکے ہوئے بستے کو اتارنے میں میری کلائیوں میں جکڑی ہتھکڑیاں آڑے آ رہی تھیں---- میں درد سے کسما کر رہ گیا، ایسا لگا میں گہرے پانیوں سے سطح پر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں، کھل کر سانس لینے کی خواہش اور اپنے گرد و پیش کے معائنے کا تجس میرے درد پر غالب آ چکے تھے۔ میں چند لمحے لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اور ہانپتا رہا، میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں! میری آنکھوں نے روشنی برداشت کرنے میں تھوڑا وقت لیا!

دیکھنے کو زیادہ کچھ تھا بھی نہیں، (Cell) سیل مجھے اس کوٹھری کی یاد دلا رہا تھا جس میں جھاڑو، بالٹی اور دیگر صفائی کا سامان رکھتے ہیں۔ تنگ---- تقریباً چار بٹہ تین فٹ--- رنگ گہرا سرخ اور چھت کافی اونچی---- ایک بے ڈھنگی کالی بالٹی نے تقریباً سیل کے ایک چوتھائی حصہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کے بازو میں ایک گندا پلاسٹک کا جگ، پینے کے پانی سے آدھا بھرا رکھا تھا--- فرش کھردرا اور گیلا تھا!

بھاری دروازوں کے بند ہو جانے کے بعد بھی میں کوٹھری کے عین بیچ کھڑا تھا--- اس انتظار میں کہ دروازہ دوبارہ کھلے گا، میں نے سوچا میں اس جگہ وقتی طور

پر ہوں اور جلد ہی مجھے تفتیش والے کمرے میں طلب کر لیا جائے گا، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میری نئی کوٹھری ہو سکتی ہے۔ تھکن سے بڑھ کر مجھے تشویش تھی---- ایک طرح کی بے چینی تھی!

کوٹھری کے سب سے سوکھے حصے پر میں نے لیٹنے کی کوشش کی، اپنا سر دیوار سے لگاتے ہوئے میں دروازے کو تکنے لگا---- آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے ماحول میں جذب ہونے کی کوشش کی---- کس قدر حیرت انگیز اور کتنی تیزی سے زندگی میں تبدیلی آتی ہے اور فوراً پرانی قدروں اور خیالات کو بدل کر رکھ دیتی ہے! پچھلا سیل یا کوٹھری جہاں میں نے پندرہ دن گزارے تھے، اس سے بڑی اور آرامدہ تھی---- مگر گھنٹہ بھر پہلے وہ دنیا کی سب سے بھیانک اور مکروہ جگہ لگ رہی تھی، میں اسے بمشکل برداشت کر پا رہا تھا! اب اس جگہ میں اپنی ٹانگیں بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔ اس وقت ایک کھردری چٹائی بھی نعمت سے کم نہیں، ہر چیز بچپن کے خوابوں کی طرح دور دور لگ رہی تھی۔ میں چھت، دیوار، بالٹی اور جگ کو یکے بعد دیگرے تکتا رہا---- یہاں دیکھنے کو اور تھا بھی کیا۔

وہ لوگ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا مگر میں پچھلی باتوں کو یاد رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ابوداؤد گارڈ ہو---- یا اس کی پیلی مسکراہٹ؟ اس کی ہر چیز یرقان زدہ تھی۔ مسکراہٹ، آنکھیں اور پھر جس طرح اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور کوٹھری سے نکلتے ہوئے میری ہمت کی داد دی، یہ سب بڑا پراسرار تھا؟ کیا میں نے اس کی رائے کو چیلنج کچھ زیادہ بے پروائی سے کر دیا؟ اور یہ بھی کہ میں اس کے اور دیگر اسرائیلیوں کے بارے میں کیا تاثر رکھتا ہوں! میں اس سے مختلف پیش بھی کیسے آ سکتا تھا؟ وہ بد اخلاق---- جھوٹا اور اشتعال انگیز تھا---- "اسقدر گرمی اور گھٹن---- پنکھے کے

بغیر تم یہاں برداشت کیسے کر رہے ہو؟ تمہیں دمہ کا مرض نہیں؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا--- ضرور یہ سب اس کی کارستانی ہے--- مجھے یہاں سزا دینے لایا گیا ہے! میری پیٹھ اور گردن پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی اور زنجیروں کا بوجھ کھل رہا تھا! میں نے اپنی پتلون کی موری زنجیر اور ٹخنے کے درمیان اڑسنے کی کوشش کی کہ رگڑ سے چھل نہ جائے، مگر ٹخنے کے پاس کی جلد لال ہو کر پہلے ہی چھل چکی تھی!

میں یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ یہ وہی زنجیریں ہیں جس سے گھوڑوں کو باندھا جاتا ہے--- اب سوچنے کو بہت ساری باتیں تھیں، یہ بھی کہ کس بات پر مسکرایا جا سکتا ہے۔ نئی کوٹھری کسی طرح کی بھی جنبش کے لئے چھوٹی تھی، پرانی کوٹھری میں کمبل سے دھاگے گھسیٹ کر میں اس کی تسبیح سی بنایا کرتا تھا اور ہاتھ پاؤں پھیلا کر ورزش بھی کر لیا کرتا تھا۔ یہ ایک طرح کا آلاپ ہو گیا تھا۔ دھاگا کھینچو--- تسبیح بناؤ--- ورزش کرو---

میں ضرور خواب دیکھ رہا ہوں--- وقت، دلدل میں پھنسے کچھوے سے بھی زیادہ سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر لمحے پر صدی کا گمان ہوتا ہے۔ وقت میں تیزی لانا اتنا ہی ناممکن نظر آتا ہے جتنا ایک مرے ہوئے گھوڑے کو دوڑانا۔ کوٹھری اتنی اچھی طرح بند تھی کہ روشنی کی ایک کرن بھی اندر نہیں آسکتی تھی، وقت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ چمکتے ہوئے بلب کی مستقل تیز روشنی میں رات اور دن کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ دیواروں کا چمکتا لال رنگ بھی آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ اتنا لال کہ آنکھیں دُکھنے لگیں--- میں اس اذیت کو کیسے برداشت کروں گا؟

مجھے وقت اور مقام کا کوئی علم نہ تھا۔ اس وقت صبح یا دوپہر ہو سکتی ہے--- یا میں لبنان یا پھر فلسطین میں ہو سکتا ہوں، یہ شمال جنوب یا مغرب

مشرق ہو سکتا ہے! ہوا میں ڈولتا ایک پَر فضا میں اڑتا ہوا درخت محسوس ہو رہا تھا، پانی میرا واحد سرمایہ تھا جو مجھے ایک ریگستانی مسافر سے زیادہ عزیز تھا، ہوش و حواس سے یہ میرا واحد رابطہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں پیاسا مر جانے سے ڈرتا تھا بلکہ پانی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں ہی وہ واحد کام تھا جسے میں طبعی حالت میں کر سکتا تھا اور اسے کھو دینے کے خیال ہی سے مجھ پر دہشت طاری ہوتی تھی! اس گرم اور حبس زدہ کوٹھری میں سانس لینا دو بھر تھا۔ ایسا لگتا تھا کسی نے میرے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا ہو۔ ننگے بلب کا عکس دیواروں کو مزید چمکا رہا تھا، گر میرے ہاتھ آزاد ہوتے، پھر بھی میں بمشکل اپنی آنکھوں کو ڈھانپنے میں کامیاب ہوتا۔ کمرہ چونکہ تنگ تھا، میں بالٹی کے سامنے بیٹھ سکتا تھا اور سر دیوار سے ٹیک سکتا تھا، بس---- اور کچھ بھی ممکن نہ تھا!

ہتھکڑیوں پر کندہ "اسمتھ اینڈ وِلسن" میں نے پڑھا---- یہ وہی مشہور کمپنی تھی جو پستول اور بندوقیں بناتی تھی---- میں نے سوچا، کوئی شئے جو زندگی یا آزادی چھین لے---- ایک لعنت ہے۔ میں نے چمکتے ہوئے دھات کو نفرت سے زمین پر رگڑا---- پھر خیال آیا اس میں دھات کا کیا قصور، جس نے اسے اس شکل میں ڈھالا ہے وہ قصور وار ہے---- جب انسان اپنی معصومیت سے آگے بڑھ جاتا ہے اس کے کھلونے بھی بدل جاتے ہیں، میں سوچتا رہا؟

مجھے خیال آیا کہ اس کال کوٹھری میں، بس میں سوچ سکتا ہوں---! میں حقیقت پسندی کے ساتھ اثبات میں سوچوں گا، ایسے خیال کا انتخاب کروں گا جو مجھے مایوس نہ کرے! ایسے انجان سفر کے متعلق سوچوں گا جو کسی ایک مقام پر رک نہ جاتا ہو---- ہر عمل کس قدر کٹھن ہے، کوئی بھی نیا ارادہ کسی جنگل کے راستے کی طرح ہے، جو کسی اندھیرے دلدل یا کھلے چراگاہ کی طرف جا سکتا ہے!

میرے سینے اور آنکھوں میں درد ہو رہا ہے، کلائیاں اور ٹخنے دکھ رہے ہیں، ہتھکڑیاں اور زنجیریں جسم میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی ہیں، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ درد زیادہ کہاں ہے؟ میں درد کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔ کیا واقعی ایک درد دوسرے پر غالب آ جاتا ہے؟ میرے دُکھتے ہوئے اعضا تقریباً آرام پا گئے۔ جب میرا ذہن درد سے دھمکنے لگا، سمندر میں نہیں بلکہ انسانی دماغوں میں خطرناک ترین طوفانی آندھیاں اُٹھتی ہیں!

آج سے دس برس پہلے، ایک یخ بستہ موسم میں، اپنے جنگجو ساتھیوں کے ساتھ، جنوبی لبنان کے پہاڑ مجھے یاد آئے! میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا---- جہنم کے تصو میں آگ، شعلے، گرمی اور تکلیف سے چیختے ہوئے لوگ---- ایسا خیال کیوں آتا ہے؟ آج سے میں یقین کروں گا کہ جہنم سرد اور یخ بستہ ہے! مجھے یاد ہے، میں مسکرا رہا تھا اور میرے دوست اس ابتر حالت پر مجھے اپنا فلسفہ بیان نہ کرنے کی گزارش کر رہے تھے!

میں نے اس جیل کوٹھری میں فیصلہ کیا کہ جہنم میں بھیڑ بھی نہ ہو گی---- جہنم تنہا اور تنگ کوٹھریوں میں بٹا ہو گا! جہنم میں چیختے اور مچلتے ہجوم کا تصور، کسی خیالی استعارے سے زیادہ کچھ نہیں! سب انسانی دماغ کے اندر اور اس کا کھیل ہے---- میرا دماغ اب تک چوکس ہے---- میں نیند سے تھک کر ٹوٹ رہا تھا اور یہ سوچ کر دہشت زدہ تھا کہ کسی جسم یا آنکھوں کو سونے اور آرام کی نعمت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ میری پچھلی کوٹھری میں جب جب مجھے نیند آتی، دروازے پر بھاری دستکوں سے مجھے اٹھا دیا جاتا تھا۔

نالیوں سے آتی فینائل کی تیز بدبو اب ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی، مجھے ڈر تھا کہ اس تیز بدبو سے مجھ پر دمے کا حملہ نہ ہو جائے۔ وقت اور صحیح مقام کی لاعلمی

سے میرا توازن بگڑ رہا تھا۔

مجھے ہر بات کو فرض کرنا پڑ رہا تھا--- ٹھیک ہے، وقت تو لوگوں کی ایجاد ہے: ہم لوگ جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخیں اور نشانیاں بالکل کامل ہو سکتی ہیں--- اب میں ایک ریگستان میں ہوں، کسی نشانی، کسی سنگِ ہدایت کے بغیر--- صرف ایک سورج ہے، جو میرا قطب نما بھی ہو سکتا ہے اور میرے لئے دھکتا جہنم بھی؟ شاید میں نے اسے فرض کر لیا تھا! جیسے ہی کوٹھری کا دروازہ بند ہوا تھا، میں خود کو تنہا اور بنجر محسوس کرنے لگا تھا۔ باقی دنیا دروازے کے اس طرف تھی، میرے خلاف متحد---!

پھر میرے اندر کا پرانا دیو جاگ کر احتجاج کرنے لگا، ساتھ ہی مجھے سمجھانے لگا--- "تم تنہا نہیں--- کئی لوگ تمہارے ساتھ ہیں یا تمہارے لئے جدوجہد کر رہے ہیں--- تم ہتھیار نہ ڈالنا--- ہمت نہ ہارنا--- حالات کے آگے سر نہ جھکانا! فی الوقت تم اپنی تاریخ مرتب کر رہے ہو! اسے بہتر سے بہتر طور پر رقم کرو--- آج سے بیس برس بعد کا خیال کرو، جب تم اپنے خاندان والوں کے درمیان بیٹھے اس وقت کی کہانی سنا رہے ہو گے! تصور کرو کہ تم کس قدر فخر محسوس کرو گے جب اس وقت کا ذکر آئے گا، ہاں--- یہ وقت، جس سے تم بچ کر نکل گئے---! شکایت مت کرو--- جتنا زیادہ یہ کٹھن ہو گا، اس قدر زیادہ عظیم الشان ہو گا!

یہ بات خلافِ قیاس ہے کہ جنگِ آزادی کے مجاہدوں پر گزری جیل کی گھڑیاں، ہماری یادوں میں اعلیٰ نمازیانہ مقام پاتی ہیں۔ تم اس وقت چار دیواری میں مقید ہو سکتے ہو، مگر خود کو غلط خیالات میں قید نہ کرو--- یہ صرف تمہیں زیر کرنے میں تمہارے دشمن کی مدد کریں گے۔ صرف تمہارا خاندان تمہاری کمی کو محسوس

نہیں کر رہا ہے--- اور صرف تم قید نہیں ہو! ہزاروں تم سے بدتر حالت میں ہیں۔ یہ کوئی کال کوٹھری نہیں---- یہ تو ایک رحمِ مادر ہے جس سے تم زیادہ پاک اور زیادہ مضبوط اور سخت جان ہو کر پیدا ہو گے----"

اس سے پہلے کہ میرے اندر کی وہ پر اثر آواز اپنی سانس درست کر کے مزید کچھ کہتی---- میں بول اٹھا---- مگر میں درد میں مبتلا ہوں---- درد اذیت اور جاں کنی---- مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں، مگر میں باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں---- ان دیواروں سے مجھے وحشت ہو رہی ہے، میں سونا چاہتا ہوں تم کہتے ہو یہ رحمِ مادر ہے--- میں اسے غلیظ اور دہشتناک کہتا ہوں! دوبارہ آواز آئی---- "تمہاری آنکھیں مقناطیسی ہیں، انہیں دیوار پر اس وقت تک جمائے رکھو کہ دیوار گر پڑے"---

میں نے وہی کیا جو مجھے کہا گیا تھا--- مرکزِ نگاہ پر سختی سے ڈٹا رہا، اس خاص نقطہ پر میری نگاہیں جم گئیں، میری آنکھوں سے تیز کرنیں نکلتی رہیں---- وہ نقطہ پگھلنے لگا---- وہاں میں نے ایک چھوٹا سا سوراخ بنا لیا، جو رفتہ رفتہ بڑا ہونے لگا اور ایک بار پھر میں باہر کی دنیا کو دیکھ سکتا تھا---- درخت گھاس، پھول----- میری نگاہیں آسمان تک چکر لگا رہی تھیں!

"دیکھا----- تم پھر دیکھ سکتے ہو----- اب دیواروں کا گلہ نہ کرنا"----- ایک پلاسٹک کی پلیٹ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دی گئی---- یہ ناشتہ ہو سکتا ہے، دوپہر یا پھر رات کا کھانا----- ہاں---- تو آج دن کیا ہے؟ ہر لمحہ رینگ رہا تھا---- جیسے اس کی گردن پر کئی ٹن ریت کا بوجھ لدا ہو، لمحے کتنے طویل ہوتے ہیں----؟ روشنی کی چمک کتنی ہوتی ہے؟ اچانک ہنسی کی تیز آواز کسی برچھی کی طرح مجھ میں پیوست ہوتی چلی گئی---- نہیں اور پھر

زندگی کا خیال کس قدر اذیت ناک ہے؟ ہنسی کی یہ آواز مجھے بیچین کر گئی! آواز دوبارہ آئی----- ایک مرد، ایک عورت---- ساتھ قریبی سڑک پر سے گزر رہے تھے--- میں ان لوگوں سے ایک دیوار کی وجہ سے الگ ہو کر رہ گیا تھا--- دیوار جو بانٹ دیتی ہے خوشی اور غم، زندگی اور عدمیت---- میں نے اپنی پیشانی اپنی بندھی کلائیوں پر جھکالی----

مجھے ایسا لگا، میں ایک چھوٹی کشتی پر سوار ہوں، جس کا مقابلہ سو فٹ اونچی لہروں سے ہے---- مجھے اندازہ نہیں کہ میں سو گیا تھا یا مجھ پر وارفتگی اور بے خودی طاری تھی----- جتنا میرا جسم قید کیا جاتا، میرا ذہن اتنی ہی تیزی سے وحشی ہو جاتا---- میں کمزور سے کمزور تر محسوس کر رہا تھا۔ غم سے کچلا، پستی میں گرا---!

میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں----- میرا گزر بتیلھم والے اپنے پرانے گھر کی طرف سے ہوا۔ میں پرانے شگاف پڑے چوبی دروازے، چوڑی پتھر کی دیواریں اور مقابل میں اپنے ہمسائے کا مکان دیکھ سکتا تھا، میری ماں دیوار سے لگی ایک ہاتھ کمر پر رکھے---- ہمسائے کی طرف دیکھ رہی تھی، بچپن میں وہ مجھے بھی ایسے ہی گھورا کرتی تھی۔ جب میں نے چلنا شروع کیا تو وہ متحیر ہو کر مجھے دیکھتی رہتی اور پوچھتی تم کیا کر رہے ہو؟

کیا مطلب---- وہ لوگ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟

کیا کر رہے ہیں وہ لوگ تمہارے ساتھ؟ تم نہیں دیکھ سکتیں؟

میں نے اپنی ہتھکڑیاں اور زنجیریں کھڑکھڑائیں---- یہ سب تمہارا وہم ہے---- وہ بولی! وہم---- یہ ہتھکڑیاں اور لال دیواریں سب وہم ہے؟ یاد ہے بچپن میں جب تم پردے کا حملہ ہوتا تھا تم روتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ تمہارا

دم گھٹ رہا ہے اور تم ڈوب رہے ہو۔ حالانکہ تمہارا سر اس وقت تکئے پر ہوتا تھا---- تمہیں وہم ہوتا تھا کہ تم ڈوب رہے ہو، اس وقت بھی تم یہی کر رہے ہو!---- ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے کہا۔ اس نے مجھ سے سو جانے کو کہا---- اس کی آواز نرم اور کسی بھی مہربان ماں کی طرح تھی---- میں نے ایک جھپکی لی---- دیوار نرم تکیہ محسوس ہوئی، مگر جلد ہی میں پیٹھ اور گردن کے درد سے اٹھ پڑا، آنکھیں کھلیں تو دیکھا میری ماں اب بھی وہاں کھڑی تھی---- اوہ۔ ماں مجھے وہم نہیں ہے---- میں چیخ اٹھا---- زنجیریں اصلی ہیں، اصلی، اصلی، اصلی---- میں انگڑائی لینا اور ہاتھ پاؤں چلانا چاہتا ہوں---- "گر تمہارے ہاتھ اور بازو آزاد بھی ہوتے تو یہاں پھیلنے اور انگڑائی لینے کی جگہ کہاں؟ اس نے کہا------

میری نظروں سے کوٹھری کا معائنہ کیا اور سر ہلا دیا۔ تم ٹھیک کہتی ہو، مگر ماں، میں تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ میری شکائتوں کو نہ ٹالو۔ ہر حالت میں زنجیروں سے آزاد ہونا کم اذیت ناک ہے۔ کم از کم ان کے بغیر مجھے درد تو نہ ہو گا اور میری جلد تو نہ چھلے گی مگر اس پر میری جرح کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح اپنے قول پر جمی رہی، اپنی نرم مگر پر اثر آواز میں اس نے پوچھا "کیا تمہیں ابراہیم غنام یاد ہے"؟ اس وقت تمہیں ابراہیم غنام کہاں سے یاد آ گیا----؟ کیا تمہیں وہ یاد ہے؟ ہاں کیوں نہیں وہ ایک اچھا مصور ہے، میں نے ہمیشہ اس کی تصویریں پسند کی ہیں، مگر کیوں؟ اس کے بارے میں تم اور کیا جانتے ہو؟ وہ مفلوج ہے اور ایک وہیل چیئر میں محدود ہے!" وہ اب کبھی اپنے پیروں کا استعمال نہیں کر سکے گا۔ مگر پھر بھی وہ زرخیز ہے۔

تمہاری قید عارضی ہے، پھر بھی تم گلہ کر رہے ہو! وہ کس طرح اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی قید سے نبرد آزما ہے اور تم ایک عارضی قید کو برداشت نہیں کر

سکتے!"

اس الجھن اور شرمندگی نے درد سے زیادہ کچوکا لگایا! میں نے اپنی نظریں جھکالیں، میں اس سے نظریں نہیں ملاسکتا تھا۔ میں شرمندہ ہوں---- میں اس سے زیادہ خود کو جواب دے رہا تھا!

ابراہیم کے عکس میری نظروں میں گھوم گئے---- ساتھ ہی ان کے عنوانات---- "شادی" "سنگترے کی فصل" "بچوں کا کلاس۔" سادہ مگر گہرے رنگوں والی مصوری نے میرا دل موہ لیا!---- اچانک درد نے شدت اختیار کی اور میں پھر چیخ پڑا! ماں مجھ سے اب بالکل برداشت نہیں ہوتا، اب تمہارا کوئی بھی لفظ مجھے آرام نہیں پہنچاسکتا، میری آواز اونچی ہوتی گئی---- مگر اس نے ایک لفظ بھی نہیں بولا---- اس کی زمرد آنکھیں غم سے گہری اور آنسوؤں سے چمک رہی تھیں---- آنسو اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے، صاف اور خاموش---- گلاب یا کسی پتہ پر شبنم کی طرح---- ایسا لگا یہ وہی گہری اداسی اور خاموش آنسو ہیں جو میری بہن الماس کی بیماری کے آخری مرحلے پر پہنچنے پر اس کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ اسے زندہ رکھنے کے لئے کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔

میری ماں کی محبت بھی! الماس مر گئی---- میں اور میری ماں دیکھتے رہے! میں کبھی اپنی بہن کے چھوٹے سے چہرے کو دیکھتا کبھی اپنی ماں کے چہرے کو---- ماں کے چہرے کے تاثر سے مجھے اندازہ تھا کہ بہن پر کیا بیت رہی ہے۔ جب وہ آخری بار اس پر جھکی تو اس کے لبوں سے پہلے آنسوؤں نے اس معصوم کا چہرہ چوم لیا!---- "میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی میرے بچے---- جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے کیا---- اب میں تجھے خدا کے حوالے کرتی ہوں---- اللہ حافظ!"---- وہ مڑی اور واپس چلی گئی---- میں مچل گیا----

اس سے منتیں کیں کہ نہ جائے، مگر میری چیخوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پیچھے مڑے بغیر ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور چلی گئی!

اس کے ٹھہرے ہوئے پر اثر لفظوں کی گونج کے بعد فضا میں میری مایوس چیخیں گونجتی رہیں---- پھر ساری گونج ختم ہو گئی---- فضا ساکت اور خاموش! ایسا لگا میں کسی گہرے غار میں بیٹھا ہوں، اس وقت میرے پاؤں کے انگوٹھے نشیب سے ٹکرائے---- میلی عدمیت کا نشیب! اس کا آخری جملہ میرے کانوں میں گونج اٹھا اور پھر مجھ میں سرایت کرتا چلا گیا---- چونک کر مجھ میں بیداری---- ایک آگہی سی آئی---- میرے اندر لاکھوں عفریت مچل اٹھے، وہ پوری طاقت، غصہ اور عزم کے ساتھ مجھ سے اٹھنے کو کہہ رہے تھے، مجھے للکار رہے تھے، میں خود کو پہلے سے زیادہ مضبوط محسوس کر رہا تھا----

میں واپس لڑوں گا---- ضرور لڑوں گا---- میں مقابلے کے لئے پھر اٹھوں گا-----!

اُو - بیروت!

رشد ابو شوار (پ - ۱۹۴۲ء)

مجھے دمشق پہنچے ابھی چند گھنٹے ہی گزرتے تھے کہ ایک منحوس خبر ملی---- دشمن نے بیروت پر بمباری کردی ہے، اسٹیڈیم کی دیواریں تباہ کردی گئی ہیں۔ درجنوں مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے ہیں---- لبنانی اخبار "السفیر" میں تفصیلی خبریں اور روح فرسا تصویریں شائع ہوئی تھیں!

میں اپنے شاعر دوست "ناظم ابو افاش" کے گھر اپنی بیوی کے ساتھ لنچ پر مدعو تھا، کچھ دیر میں نے "افاش" کی نظموں سے خود کو بہلانے کی کوشش کی، مگر شاعر "ممدوہ ادوان" کے آتے ہی اور اس کے اترے چہرے کو دیکھتے ہی میں دوبارہ مضمحل ہو گیا۔ "تم نے کچھ سنا؟" آتے ہی اس نے مجھ سے سوال کیا "اُن لوگوں نے جنوب کی طرف بھی چڑھائی شروع کردی ہے"! اس نے دوسری خبر سنائی! ماحول پر خاموشی مسلط تھی اور جنگ پورے شباب پر چھڑی ہوئی تھی! جون کی پانچ تاریخ تھی--- مجھے حیرت ہوئی کہ یہ سب جون کے مہینے میں کیوں؟ مجھے فکر لاحق تھی کہ مقابلہ ہم کتنی دیر کر پائیں گے؟ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ تازہ حملہ کس قدر سنگین ہوا ہے؟ ایک بار پھر ۱۹۶۷ء کی شکست کی تلخ یادیں مجھے بے چین کرنے لگیں!

مجھ سے بیٹھا نہ گیا--- افاش اور اس کی بیوی سے اجازت لے کر ہم لوگ رخصت ہوئے، چلتے چلتے اس نے پوچھا "اس قدر بے چینی کیوں؟--- تمہیں تو اس کا عادی ہو جانا چاہیے"! میں نے اپنے آپ سے کہا "کیسا اعتماد اور پھر اطمینان

کیونکر ہو---- ساتھ ہی رجائی بھی کیسے ہوں ہم لوگ!

سڑک پر ہر ایک پریشان دکھائی دے رہا تھا---- جب ہم لوگ کیمپ پہنچے، لاوڈ اسپیکر پر اعلان ہو رہا تھا کہ فوری طور پر خون کا عطیہ دیا جائے---- اعلان کے بعد رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں---- ہم لوگ "یار موک کیمپ" میں تھے۔ کیمپ کوئی بھی ہو---- ان میں باقی عرب دنیا سے علیحدہ ایک دنیا آباد تھی! یہاں ہر طرف آنسو، خون، خوف، بدبو اور مایوسی تھی---- میں نے دیکھا بے شمار نوجوان مرد اور عورتیں، خون کا عطیہ دینے "ڈیٹر یارموک کلینک" کی طرف جارہے تھے اور بہت سے واپس آرہے تھے، یہ ان کی وابستگی کا ثبوت تھا! اب کیا ہونا چاہیے؟ اب جب کہ صیہونیوں نے یکے بعد دیگرے چڑھائی شروع کر دی ہے، ہمیں اپنے انقلاب، اپنی عزت، اپنا مستقبل اور اپنے خوابوں کو بچانا ان کی پرورش کرنا ہے، انہیں آگے بڑھانا ہے!

مہینوں سے ہمیں اس جنگ کا خدشہ تھا، اس بار پچھلی تمام جنگوں سے بڑھ کر خوں ریزی کا اندازہ تھا، ہم لوگوں نے اب تک دشمن سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری بھی نہیں کی تھی---- جب کہ ہمارے دشمن جدید امریکی اسلحوں سے پھوٹے پڑتے تھے، ان کا فیصلہ قطعی تھا، ہم میں مستقل مزاجی ضرور تھی مگر وہ امریکہ کے شہ پر مغرور اور عرب دنیا کی خاموش خلا سے پُر امید اور مطمئن تھے! وہ عرب جو اپنے گروہ سے سختی برتتے ہیں مگر اپنی سرحدوں کو دشمنوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں!

میرا دوست عبدالھادی اور میں کیمپ میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ فوراً روانہ ہونا چاہیے! اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو الوداع کہا اور میں اپنے خاندان سے ہم کلام ہوا------ "اس بار حملہ بہت سنگین ہے----

تمہیں یاد ہے میں کیوں اپنی سڑک کو "بیروت کی آخری سڑک" کہتا آیا ہوں---- مجھے معلوم ہے وہ لوگ ہماری سڑک تک ضرور پہنچ جائیں گے---- میں نے اکثر اس کے بارے میں لکھا بھی ہے، کہ تم میری موت کی خبر پانا، اس وقت خود پر قابو اور اعتماد رکھنا---- غم کرنا مگر اسے خود پر یا بچوں پر حاوی ہونے نہ دینا، ان جگر گوشوں کی پرورش اچھی طرح کرنا اور ان کی تعلیم میں کوتاہی نہ کرنا---- مجھے یاد ہے میں پچھلی جنگوں میں بہادر رہا ہوں دعا کرو اس بار بھی میرے قدم ثابت رہیں، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا---- میں وعدہ کرتا ہوں"----!

"تمہیں معلوم ہے۔" میری بیوی نے پوچھا---- "آج فہد خون کا عطیہ دینے کلینک گیا تھا، وہاں اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ وہ ابھی صرف بارہ سال کا ہے---- اس نے رو رو کے برا حال کر لیا۔ وہ بڑا مایوس تھا---!" تب تو میں جیت چکا ہوں!

میرا بیٹا فہد---- اس عمر میں فلسطین کی اہمیت جانتا ہے! اور اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے! آج وہ اپنا خون دینے کو تیار ہے، بلا جھجک اس نے اپنا بازو آگے بڑھا دیا ہے---- یہ وہ دبلے پتلے گندمی فلسطینی بازو ہیں جو کل بھاری بوجھ اٹھائیں گے! خدا حافظ---- الوداع---- میرے بچے الوداع!

یہودی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم ان کا سامنا کرنے جا رہے ہیں! میرے باپ نے ایک بار کہا تھا--- "دیکھو رشد، ہم لوگوں نے جب فلسطین کو الوداع کہا تھا، ہمارا کنبہ بس ہم اور تم تھے---- تمہاری ماں "زینب" اور تمہاری ہمشیر "مازوزہ" فلسطین پر قربان ہو گئیں---- آج تمہارے خاندان میں چھ لوگ ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ہم لوگ اس طرح پھلے پھولیں گے!"

ہاں ---- ہماری نسل کی افزائش ہوئی ہے ---- یہ اچھا اور ضروری بھی ہے! میں خود کو قربان کر سکتا ہوں، مگر میرے پیچھے یہاں فہد موجود ہوگا اور اس کی جگہ چھوٹا طیب اور پھر اہلام، میری لختِ جگر جس نے میری ماں اور بہن کی کمی کو پورا کیا ہے ---- ساتھ ہی وہ تیز طرار "غسّان" ہم سب کی جگہ کھڑا ہوگا۔ اپنے سب سے چھوٹے بچے کا نام ہم لوگوں نے معروف ادیب "غسان کنافانی" (شہید) کے نام پر رکھا تھا۔ ظالموں نے غریب کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ مگر اس کی تحریر، اس کے ناول، اس کی کہانیوں کو برباد نہ کر سکے، اس کی تاثیر اور مقبولیت کو بھی ختم نہ کر سکے ---- وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے اور رہے گا!

رات گئے ہم لوگ بیروت پہنچے ---- السّلام اے بیروت ---- السّلام اے فاکھانی کوارٹر ---- شہید اسٹیڈیم السّلام!

"اپنوں نے ہماری پیٹھ پر وار کیا ہے"

جنگ جنوبی لبنان سے فاکھانی کوارٹر تک پھیلی ہوئی تھی----!

فاکھانی ہماری آخری شاہراہ تھی--- اس کی حفاظت کون کرے گا۔ کیسے کوئی فصیل کھڑی ہو گی---- کون ہتھیلی پر جان رکھ کر حملہ آوروں کا سامنا کرے گا، اس جنگ کو شروع ہوئے ہفتہ ہو گیا، پچھلے سات شبانہ روز جیٹ بم برسا رہے ہیں، ٹینک آگ اگل رہے ہیں، ایسے مہلک ہتھیاروں کا استعمال ہو رہا ہے جو اس سے پہلے کہیں نہ ہوئے تھے، ہر شے جل کر خاک ہوئی جا رہی ہے!

"خدا نے دنیا کو چھ روز میں مکمل کیا اور ساتویں روز اس نے آرام کیا!" تورات یہی کہتی ہے--- یہی "یوم سبت" کہلاتا ہے! مگر اس بار یومِ سبت کے موقع پر جنگ کے دیوتاؤں نے آرام نہ کیا، وہ اس دن بھی اپنے راکٹ اور میزائل کا شمار اور حساب کرتے رہے! سارے چچماتے نئے ہتھیار، سارے امریکی، خاص طور پر فلسطینیوں اور لبنانیوں کے لئے بھیجے گئے تھے۔ بارھویں جون کی شب گئی اور جنگ کا دیوتا، جس نے یومِ سبت پر آرام نہیں کیا تھا۔ اب تک تازہ دم تھا!

ہمارے بھائی ہماری مدد کو نہ آئے!

عربوں کی سرزمین خاموش ہی رہی، پڑوسی عربوں کی دولت اور جھوٹی انا آنکھ مچولی ہی کھیلتی رہی! ہم پر ظلم ہوتا رہا اور سب دیکھتے رہے! میں معبود کی قسم کھاتا ہوں کہ ان میں کچھ دشمن کی پشت پناہی بھی کر رہے ہیں اور مالی امداد بھی اور کچھ سب دیکھتے ہوئے چشم پوشی بھی کر رہے ہیں۔ اس طرح نہ صرف وہ ہمارے جذبات مجروح کر رہے ہیں بلکہ نفسیاتی طور پر ہمارے عزم کو کھوکھلا کر رہے ہیں---- میرے خدا کیا جو کچھ ہو رہا ہے، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا، یہ کیسی مصلحت

ہے؟

ہمارا غم لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا! یہ سچ ہے کہ ہم اپنی مٹی اپنی مادرِ وطن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ عربوں کی عزت و ناموس کی جنگ کیوں نہیں بن جاتی؟

اخبار "النہار" میں اسرائیلی فوج اور ان کے شاہی استقبال کی تصویریں ہم نے دیکھی ہیں ہم نے فاشسٹ لبنانی "فلانگسٹ" لڑکی کو بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ایک اسرائیلی فوجی کو گلاب پیش کرتے بھی دیکھا ہے! یہ بھی ایک عجیب گروہ ہے، انہیں مادرِ وطن سے کوئی تعلق نہیں، انہیں قومیت پر کوئی اعتقاد نہیں--- ان سب کی قیمت فلسطینی ادا کرتے ہیں---- جب تک وہ اپنی قوم کے لئے لڑ رہے ہیں وہ ایسے فرقہ پرستوں کی وجہ سے اپنی شناخت کی قیمت اپنے خون سے ادا کرتے رہیں گے!

لبنانی فوٹو گرافر احمد، عینی شاہد کے طور پر اپنی کیمرے کا استعمال کرنے جا رہا تھا کہ ایک فاشسٹ نے کہا--- "تم مغربی بیروت کے لبنانی ہو---- منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر واپس چلے جاؤ ورنہ----" دوسرے نے کچھ سوچے بغیر رائفل کا دستہ اس کے چہرے پر دے مارا---- بیچارہ لہولہان واپس آیا!

"ان بے ضمیر "فلانگسٹ" سے تم کیا توقع کر سکتے ہو احمد"؟ یہ فرقہ جو اسرائیلیوں سے اپنے معاہدے اور نسبت پر فخر کرتا ہے---- تم کر بھی کیا سکتے ہو احمد---- تم ایک لبنانی---- ایک فلسطینی اور ایک عرب ہو!"

"غم کی قندیلیں"

ہاں---- بیروت سوگوار ہے آج!

عرب ریڈیو کی نشریات سے جو کچھ سنا---- اس پر پہلے وہ شرمسار پھر حیران ہوا---- بڑا پریشان کون منظر تھا---- اس نے دیکھا اسرائیلی بڑے ترنگ میں پہاڑی پر سے گزر رہے ہیں، وہ بغیر جنگ کے فاتح تھے، اس کا دل غم سے چوُر چوُر ہو گیا!

بیروت نے لالچی عرب عہدہ داروں کے بیانات بھی سنے، جو فلسطینیوں اور لبنانیوں کے خون سے اپنے معاملات سدھار رہے تھے، اور موقع کا فائدہ اٹھا رہے تھے، ہم ایسے دوست، ایسے پڑوسی اور ایسے عربوں سے کیا توقع کر سکتے ہیں!

بجلی کا فقدان ہے اور پانی کی بڑی قلت ہے! موم بتیاں گیس کے لالٹین اور قلم کے سائز کی فلیش لائٹ کی بڑی مانگ ہے۔ ان حالات میں بھی کچھ لوگوں کا کاروبار چمکا ہوا ہے!

ناند میں جلتی لکڑیاں اور اس کے دھوئیں سے رات مزید کالی ہو رہی ہے، فضا بوجھل ہے! مجاھد سڑکوں پر ننگے پاؤں پہرہ دے رہے ہیں۔ یا جیپ میں انقلابی گیت گاتے گھوم رہے ہیں۔ اس غمگین اور دل برداشتہ لمحوں میں، مجھے جیریکو کی ایک لڑکی یاد آئی، جسے میں کبھی چاہتا تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ اس وقت یہ یاد کیسی؟ شاید موت کے لمحات میں ہم لوگ محبت اور خوابوں میں پناہ ڈھونڈتے رہی، میری نیم خوابیدہ حالت میں وہ بڑی متانت سے آئی---- اس کی آنکھوں میں غم اور ایک سوال تھا! "تمہیں ماحول سے وحشت اور مایوسی ہو رہی ہے اور تم محبت اور خوابوں میں پناہ چاہتے ہو، مگر فلسطین کے دامن میں محبت اور

خوابوں کے علاوہ ہے کیا"؟ اس نے بہت پیار سے مجھ سے پوچھا!

جب میں نے آنکھیں کھولیں---- میں نے اپنے دریچے پر ایک ٹمٹماتی قندیل دیکھی---- میں نے بیروت کے ہر دریچے پر غم کی قندیلیں ٹمٹماتی دیکھیں---- مجھے لگا بیروت خود ایک قندیل ہے جو ہوا کے زور پر پھڑپھڑا رہی ہے---- مگر اپنے گردو پیش کے تمام اندھیروں کے باوجود روشن ہے!!!

آخری التماس

میں اپنی بالکنی میں کھڑا اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، خیال میں ان کی شبیہہ بنا رہا تھا---- میں اپنے ان بھائیوں کی شکل بھی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جن سے ملاقات کئے کئی برس بیت چکے تھے۔ وہ لوگ امان میں مقیم ہیں، جہاں میرا داخلہ ممنوع ہے---- کئی بار میرا ویزا رد کیا جا چکا ہے۔ میرے باپ اور بھائی امان میں رہتے ہیں، میری بیوی اور بچے دمشق میں رہتے ہیں اور میں تنہا بیروت میں ہوں! ایسا ہوتا ہے ایک صحیح معنوں میں فلسطینی خاندان۔

عبدالعزیز ایک مجاھد ہے، اس کا اپنا خاندان گیلیلی میں ہے، اس کا ایک بھائی لندن میں ہے، دوسرا جرمنی میں اور دو بہنیں دبئی میں، وہ سب کسی عرب ملک میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ سب لندن میں ملاقات کرتے ہیں۔ ان کا خاندان خوش قسمت ہے کہ وہ مل بیٹھنے کی صورت اور سبیل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۸ء کی ہیبت ناکی کے بعد وہ پہلی بار یکجا ہوئے تھے!

یہودی ہر دور میں اپنی صعوبتوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بتاتے رہے ہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ وہ جتنا روتے ہیں اتنا ہی دنیا سے مطالبہ بھی کرتے ہیں، امریکہ اور یورپ بھی ان کی خوب طرفداری کرتا ہے اور ان سوپر پاور کی شہ پر بیروت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔

ہم دنیا سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہے ہیں ہم تاریخ اور زندگی سے اپنا حق طلب کر رہے ہیں---- دشمن ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ دراصل وہ اپنی بقا کے لئے ہمیں صفحۂ ہستی اور تاریخ کے صفحات سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔

ہماری ہستی خواہ کتنی کمزور ہو ہم زندہ رہیں گے!

تماشبین

خلیل صواحیری

اسرائیلی قبضے کے چند ماہ بعد تک میں نوکری کے لئے تگ و دو کرتا رہا، بڑی کوششوں سے ایسی نوکری ملی کہ میرا یروشلم کے پرانے شہر میں رہنا ضروری ہوگیا تھا---- میری شستہ زبان اور کلین شیو دیکھ کر "زہرہ ہوٹل" کا منیجر مجھے ویٹر کی نوکری دینے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ مجھے ضرورت تھی اس لئے ۳۲۰ اسرائیلی لیرا ماہانہ، ایک وقت کا کھانا اور ایک کالے سوٹ کے عوض میں اپنی ڈگری بھول کر اس وقتی مصروفیت سے خوش ہوگیا تھا!

رات گاؤں جاتے ہوئے اسرائیلی چیک پوسٹ پر سوال و جواب کی مصیبت سے بہتر تھا کہ میں شہر میں کوئی مسکن تلاش کرلوں---- مگر جب میں ایک کمرے کی تلاش میں نکلا تو پاؤں میں چھالے پڑ گئے، یہ مرحلہ نوکری حاصل کرنے سے زیادہ مشکل نکلا، آخر کار مجھے پرانے شہر کے سب سے مشہور مگر سب سے گندے علاقے "وادا سٹریٹ" میں کمرہ مل گیا---- اس علاقے میں منشیات کا دھندا، قمار خانے، قحبہ خانے ساتھ ہی مجرموں کا بسیرا تھا---- میں نے مجبوراً یہ کہہ کر خود کو تیار کرلیا کہ اچھی جگہ ملتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا!

میرا کمرہ ایک دو منزلہ عمارت کی چھت پر تھا۔ اس عمارت میں بے شمار کمرے اور لاتعداد لوگ رہتے تھے، صبح و شام آتے جاتے مجھے ہر منزل پر اور تقریباً ہر کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے، گلا کھنکھار کر "یا ستر" یعنی پردہ کرلو کہنا پڑتا تھا۔

تاکہ خواتین اندر چلی جائیں پردہ کرلیں---- پڑوسیوں کے بارے میں

جاننے کی نہ مجھ میں خواہش تھی نہ وقت، پھر بھی رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں چھ خاندان آباد ہیں--- ساتھ ہی صحن کے ساتھ والے کمرے میں ایک عورت تنہا رہتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ عموماً اسے نظر انداز کرتے ہیں---- وہ بھی خاموش، سبھوں سے الگ تھلگ رہتی ہے! مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اس پر طرح طرح کا شک کرتے تھے---- مگر جب میں نے پہلی بار اس عورت کو دیکھا، مجھے خواہ مخواہ اپنی خالہ نعیمہ یاد آ گئیں۔ صحن کے لوگوں کی چہ میگوئیوں سے مجھے بھی اس عورت کی ذات سے دلچسپی اور تشویش دونوں ہوئی، مگر ایک عرصے تک وہ میرے لئے ایک معمہ ہی رہی---- اور میرا تجس اس کے لئے بڑھتا ہی رہا!

ایک شام جب مالک مکان کرایہ وصول کرنے آیا--- میں نے کرایہ دیتے ہوئے پوچھا "صحن کے کنارے والے کمرے میں جو عورت رہتی ہے---- وہ کون ہے"؟ مالک مکان کے چہرے پر ایک مکار سی مسکراہٹ تھی "تو تم بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے؟" مجھے اس کا جملہ اچھا نہ لگا---- میرے چہرے کا تاثر دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا---- "ابھی تم نئے ہو---- اپنے کام سے کام رکھو۔ ویسے لوگ کہتے ہیں کہ خاتون وضع دار ہے، ہاں---- کچھ خاص لوگ رات دس بجے کے بعد خاموشی سے آتے ہیں اور خاموشی سے چلے جاتے ہیں" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا---- "ہم بس اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں!" میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس کا نام کیا ہے"؟ اصل نام کون جانتا ہے، ویسے لوگ "ام احمد" کہتے ہیں---- "اس کا تعلق کہاں سے ہے؟" سنتے ہیں یافضہ کی ہے، ۱۹۴۸ء کی جنگ میں سنا اس کا شوہر مارا گیا تھا---- یہ بھی سنتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا کویت میں ہے، مگر میں نے کبھی کسی رشتہ دار کو دیکھا نہیں----- بس توبہ ہے---- بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا---" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا!

میں نے جو کچھ سنا تھا دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ یعنی ایک فاحشہ! یہ لفظ میرے ذہن میں گونج اٹھا! تو کیا ہوا! ہو سکتا ہے کوئی مجبوری ہو--- مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی---- میرے ہوٹل کے آس پاس کتنی سفید پوش عورتیں ٹہلتی رہتی ہیں---- انہیں دیکھ کر کون کہے گا کہ---- مگر امِ احمد کی بات کچھ اور ہے---- وہ ایسی نہیں ہو سکتی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ نعیمہ خالہ کی مشابہت کی وجہ سے ہو سکتا ہے اس عورت کے لئے میرے دل میں جگہ بن گئی ہو--- یا میری ہمدردی ان مردوں کی طرح تو نہیں جو طوائفوں سے انسانیت کے ناتے ہمدردی جتا کر ان کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں!

طرح طرح کے سوالوں میں الجھا میں اپنی کھڑکی سے لگ کر خاموشی سے امِ احمد کے کمرے کا جائزہ لینے لگا---- رات دس بج چکے تھے لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند تھے، صحن میں سناٹا تھا، اچانک ایک سایہ امِ احمد کے دروازے پر نمودار ہوا--- میں نے فوراً سوچ لیا کہ کوئی گاہک ہے، مگر دروازہ کھلنے پر روشنی میں ایک اور عورت نظر آئی جو ہمارے مکان کی نہیں تھی! امِ احمد خاموشی سے اسے اندر لے گئی، کچھ دیر تک دونوں کسی مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے بات کرتی رہیں، مجھے حیرت تھی کہ دوسری عورت کون ہے اور اس وقت کیا کرنے آئی ہے---- کیا وہ کوئی دوست ہے؟ مگر ایسی عورتوں کی دوست کہاں ہوتی ہیں؟ پھر ہو سکتا ہے پارٹنر ہو؟ مگر سنا تھا کوئی فاحشہ اپنی ہی پیشہ رقیب کو برداشت نہیں کر سکتی! پھر یہ نسبت کیسی ہے؟ کوئی گھنٹہ بھر کی گفتگو کے بعد وہ عورت رخصت ہوئی، دونوں کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کا تاثر تھا، گویا کام ہو گیا ہے! پتہ نہیں کیوں اچانک میرا گمان اس عورت کے بارے میں بدل گیا--- میں کچھ اداس بھی ہو گیا--- جیسے کوئی ٹریجک فلم دیکھ کر نکلا ہوں---- اگلے دن میری چھٹی

تھی---- میں یہ سوچ کر بستر پر دراز ہو گیا کہ کل امِ احمد کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کریں گے!

خلافِ معمول، صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی---- میں نے فوراً کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، امِ احمد بھی کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی، آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر میں دوبارہ کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آج وہ سیاہ لباس میں کچھ زیادہ سنجیدہ مگر پُروقار لگ رہی تھی، ٹھیک بارہ بجے وہ اپنے کمرے میں تالہ لگا رہی تھی۔ میں نے بھی تیزی سے کمرہ بند کیا اور منٹوں میں نیچے آ گیا۔ مکان سے نکل کر وہ کوچہ حبس العبید کی طرف چل پڑی، میں پُرپیچ گلیوں میں کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے چلتا رہا، کچھ ہی دیر میں وہ مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ عورت مجھے کہاں لے جا رہی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے یہاں آئی ہو----؟ یا پھر راتوں رات رابعہ بصری کی روح اس میں حلول کر گئی ہو؟ میرے خدا میں یہ سب کیا دیکھ اور سوچ رہا ہوں؟

میرا سر چکرانے لگا، یہ سوچ کر بڑی کوفت ہو رہی تھی کہ ایک بدنام عورت کا پیچھا کرتے میں مسجد میں آ گیا تھا! مگر میں کیسے کہہ سکتا ہوں یہ عورت کون ہے؟ میں وضو کے حوض کے قریب ہی بیٹھ گیا اور فیصلہ کیا کہ نماز باہر صحن میں ادا کروں گا! تاکہ نماز کے بعد اس عورت کو ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو---- میں کچھ شرمندہ بھی تھا کہ اس مبارک دن کسی عورت کا پیچھا کیا ہی کیوں؟

نماز کے بعد میں نے تیزی سے جوتا پہنا اور باہر گیٹ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ مغربی گیٹ کے خواتین والے حصے سے عورتوں کی ایک جماعت نکل کر ایک طرف جمع ہونے لگیں۔ ان میں سے کئی ایک نے گلدستے سنبھالے ہوئے تھے اور چند ایک نے کالے پرچم اٹھا رکھے تھے۔ میں ابھی حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا

عورتوں کا ایک اور گروہ سیاہ لباس میں تیزی کے ساتھ مسجد کے گیٹ سے باہر نکلا---- انہوں نے سفید بینر اٹھائے ہوئے تھے، جن پر سیاہ جلی حرفوں میں لکھا تھا "غاصبو! یروشلم سے دفع ہو جاؤ"---- ایک اور بینر پر لکھا تھا "شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا!" عورتیں بیخ کر نعرہ لگا رہی تھیں، "یروشلم عرب ہے اور عربوں کے لئے رہے گا" عورتوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا- بیخ بیخ کر ان کا گلا بیٹھا جا رہا تھا- مسجد سے نکلتے مردوں کو حیرت اور شرمندگی دونوں تھی- رفتہ رفتہ عورتوں کا جلوس جوش کے ساتھ تعداد میں بڑھتا چلا گیا---- ایسا لگ رہا تھا کہ شہر کی ہر عورت یہاں جمع ہو گئی تھی- میں منہ کھولے اس عبرتناک منظر کو دیکھ رہا تھا، مگر میری آنکھیں اب بھی ام احمد کی منتظر تھیں، اچانک اس بچے کی پریشان خیالی کے ساتھ جس کی ماں بھیڑ میں کھو جائے---- وہ مجھے نظر آئی---- مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا ام احمد جلوس کے آگے آگے ہاتھ میں سیاہ پرچم اٹھائے، پورے جوش و خروش کے ساتھ بیخ رہی تھی:

"یروشیلم عربوں کا ہے---- صیہونی طاقت مردہ باد"

اچانک مجھے خیال آیا ۱۹۶۷ء کی جنگ کی آج پہلی برسی ہے، اور یہ جلوس اس کی یاد میں نکالا جا رہا ہے کتنے شرم کی بات ہے، ام احمد کو نہ صرف اس کا علم تھا بلکہ وہ پوری تیاری بھی کر رہی تھی اور میری طرح کے مرد اور کچھ مذہبی داڑھی والے بھی نہ اس میں حصہ لے رہے تھے، نہ ہی انہیں یہ دن یاد تھا! مگر ام احمد کو اس جلوس کی خبر کیسے تھی؟ پچھلی رات وہ عورت جو اس سے ملنے آئی تھی، وہ کون تھی---- اور پھر ام احمد کا پیشہ؟ میرے ذہن میں پھر طرح طرح کے سوال مچلنے لگے! اتنے میں لوگوں کا ایک سیلاب آیا اور میں غیر ارادی طور پر اس جلوس میں

شامل ہو گیا! جلوس ساحرہ گیٹ سے ہوتا ہوا جب عمر یہ اسکول تک پہنچا، کچھ پولیس والے بھی آس اس سے نمودار ہونا شروع ہو گئے! مجھے خطرے محسوس ہونے لگا۔ میں قریب کی ایک گلی سے ہوتا آگے نکل گیا تاکہ اگلی شاہراہ پر دور سے جلوس کی کارروائی دیکھوں گا۔ ابھی جلوس ساحرہ گیٹ سے نکل کر سامنے کے میدان میں جمع ہو رہا تھا کہ پاس کی گلی سے اچانک بڑی تیزی کے ساتھ چند گھوڑ سوار پولیس والے ہاتھ میں چابک لہراتے جلوس پر ٹوٹ پڑے---- ان لوگوں نے عورتوں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ایک کہرام مچ گیا۔ عورتوں کی چیخ و پکار کے ساتھ گھوڑے بھی زور سے ہنہنا رہے تھے۔ پہلے گلدستے زمین پر کچلے گئے---- پھر پرچم ہاتھوں سے گرے---- اور دیکھتے ہی دیکھتے بھگدڑ مچ گئی!

اس کے ساتھ ہی گھوڑسواروں نے سبھوں پر اندھا دھند چابک برسانا شروع کیا--- اس سے پہلے کہ میں وہاں سے فرار ہوتا، کسی عورت کی چیخ سنائی دی--- "یہودی نظام مردہ باد"! میں نے گھوم کر دیکھا، یہ ام احمد کی آواز تھی---- ایک گھوڑسوار تیزی سے اس کی طرف بڑھا---- ساتھ ہی بھیڑ کا ایک ریلا میری طرف آیا اور مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا۔ عورتیں چیخ رہی تھیں---- سائرن بجاتی پولیس کی ایک وین آئی جس سے مشین گن سنبھالے فوجی اترے اور لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کیا، تقریباً بھاگتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا، راستہ خون سے لت پت تھا پتہ نہیں کون کام آیا تھا؟

آخر کار بچتا بچاتا میں اپنے مکان میں داخل ہوا۔ ایک لمحہ میں ام احمد کے دروازے پر رکا۔ ابھی تک اس میں تالہ پڑا تھا--- شام آئی اور پھر رات ہو گئی، میں اپنی کھڑکی سے لگا اس کا انتظار کرتا رہا--- مگر نہ وہ آئی نہ ہی میں سو سکا!

دوسری صبح، ہوٹل کا اسٹاف بڑے افسوس اور عقیدت کے ساتھ "ام

احمد" نامی کسی عورت کی شہادت کا ذکر کر رہا تھا--- جسے گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روند ڈالا گیا تھا---! ہر ایک ہر طرح کی ہمدردی جتا رہا تھا!

میں سب کچھ سن کر خاموش تھا--- میں چاہتے ہوئے بھی یہ نہ بتا سکا کہ اس غریب کے بارے میں میرے مالکِ مکان کی کیا رائے ہے!

میں نے فیصلہ کیا آج رات ہی میں اس مکان کو چھوڑ دوں گا---!

اب میرے لئے وہاں رہنا ناممکن تھا!!

کدیما

(عبرانی لفظ، جس کے معنی ہیں حملہ)

سلیمان الشیخ

"فائر، حسین ----- گولی چلاؤ!"

"کدیما ----- کدیما ----- آگے بڑھو ---- حملہ کرو!"

اس کا کمانڈر الہیٰ، اپنی فیلڈ گلاس سے جنگ کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آڈر سنا --- "حسین نشانہ ٹھیک لگاؤ۔" اس نے اپنے گردو پیش دیکھا، سوائے دھول گرد، جستے اور اسٹیل کے ٹکڑے، لکڑی، پتھر اور کنکر کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا --- "شوٹ حسین، شوٹ! تم سو تو نہیں رہے؟" اس کے ساتھ کی آواز قریب ہی کہیں سے آئی، پھر اس نے بغیر سوچے نشانے لگائے، اندھا دھند گولیوں کی بوچھار کر دی!

رفیوجی کیمپ کے مشرقی حصے پر بم برساتے فائٹر جیٹ واپس جا چکے تھے، ان دھماکوں سے اس کا دل دہلا جا رہا تھا اس نے قریب کی ایک کھائی میں پناہ لی، اسے خطرہ تھا کہ کوئی آوارہ گولی اس کے پرخچے اڑا سکتی ہے، لمحہ بھر کے وقفے کے بعد کمانڈر کی آواز دوبارہ سنائی دی --- "حسین، ہائیم اور اسحاق مشرق کی طرف بڑھو ---- اُس ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے گولیاں آرہی ہیں ---" وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ آگے پیچھے دیکھتے ہوئے آگے سرکنے لگا، ایک سنسناتی گولی اس کے سر کے بالوں کو چھوتی گزر گئی، اس نے فوراً خود کو قریب کے گڑھے میں گرایا، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے! "خدا میرے باپ کو غریقِ رحمت

کرے، مرحوم ہمیشہ کہتے تھے---- جنگ میں بھائی کو بھائی کی پہچان نہیں رہتی---- ہمیشہ جنگ سے انکار کرنا" پورا علاقہ ایک بار پھر لرز اٹھا، بمبار طیارے واپس آ کر دوبارہ بم برسا رہے تھے---- وہ زمین پر اوندھا لیٹا رہا---- ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا، نیا آڈر سنائی دیا---- "بٹالین اکیس---- حملہ کرو، خاموش اور احتیاط سے آگے بڑھو"! اس نے ہاشم کو اپنے قریب ہی دیکھا، دونوں ایک تباہ شدہ مکان کے ڈھیر پر کھسک رہے تھے۔ ہر طرف سے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ بمبار طیارے آگ کی بارش کر رہے تھے، پورا علاقہ جل رہا تھا، جو کچھ بچا تھا اسے ٹینک اور میزائل تباہ کرنے سے نہیں چوکتے تھے، مُردوں کی تعداد کا شمار مشکل تھا---- مگر کھنڈرات میں جنگ جاری تھی۔ مُردے اور ملبے کی پہچان بھی مشکل تھی---- "شہروں کو قبرستان بنانے والو---- خدا تم سے سمجھے!" میرا ذہن پتہ نہیں کیا کچھ سوچتا رہا، مجھے ایک پھریری سی آئی--- ایسا لگا کسی نے میرے ذہن میں ابلتے سوالوں کو پڑھ لیا ہو---- آڈر ایک بار پھر دہرایا جانے لگا"

اسحاق حملہ---- ابراہیم شوٹ---- ہاشم اور حسین کہ یما---- کہ یما!"

اس جہنم میں ہم کیا کر رہے ہیں؟ میرے ذہن میں سوالات پھر مچلنے لگے---- ان معاملات سے میرا کیا تعلق؟

۱۹۷۸ء کی جنگ میں عین بھرتی کے وقت میرے اپنڈیسائٹس کے درد نے پریشان کیا تھا اور میں صاف بچ گیا تھا، اس بار میں کوئی خاطر خواہ بہانہ تراش نہ سکا، پھر ۱۹۷۸ء کا آپریشن اور ۱۹۸۲ء میں زخم، یہ بہانہ کچھ مناسب نہ تھا۔ میں نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا، مگر اس میں بھی بے پناہ رکاوٹیں نظر آئیں---- "حسین شوٹ---- پیچھے سے کوئی چیخا---- دشمن تمہارے قریب بڑھتے آ رہے ہیں،" اس نے آنکھیں موند کر مشین گن کی لبلبی دبا دی اور چاروں سمت چند منٹوں تک

گولی چلاتا رہا---- اسے کوئی بھی نظر نہ آرہا تھا بس اس کے سر پر سے زن زناتی گولیاں گزر رہی تھی، اس نے قریب ہی دیوار تک پہنچنے کے لئے جست لگائی، مگر بیچ میں کسی سے ٹکرا گیا، شاید کوئی انسانی جسم---- اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، لڑکھڑاتا ہوا وہ کسی اور جسم پر گر پڑا۔ جب اس نے غور سے دیکھا تو اس کے آس پاس بے شمار لاشیں بکھری پڑی تھیں، اور وہ باقاعدہ ایک بوڑھے کے سینے پر سوار تھا۔ بوڑھے، عورتیں، بچے---- جنگ سے ان معصوموں کا کیا تعلق؟

اس نے حلق میں کچھ پھنستا محسوس کیا، طبیعت متلائی مگر چند ابکائی کے سوا کچھ نہ ہوا، لاشوں کی سڑاند سے فضا بوجھل ہو رہی تھی، اس نے لاش پر سے اٹھنے کی کوشش کی اور یکایک جو کچھ صبح کھایا تھا، اس پر نکال دیا، اس کی آنکھوں سے گرم آنسو بہہ نکلے---- حالانکہ وہ ابھی تک رویا نہیں تھا!

انسانوں بلکہ مظلوموں کا قتلِ عام----- لعنت ہے مجھ پر اور مجھ جیسے لوگوں پر! اس کے کان بج اٹھے، دوبارہ باپ کی آواز سنائی دی "جنگ میں باپ بیٹے کو اور بھائی بھائی کو مار دیتا ہے"! خداوندا میرے باپ کی روح کو سکون عطا کر----!

پچھلے پانچ روز سے گھمسان کی جنگ جاری تھی، ہوائی جہاز، ٹینک اور پانی کے جہاز مسلسل بمباری کر رہے تھے، مگر اب تک ہم لوگوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے! ان کے سروں پر گولیاں سنسناتی گزر رہی تھیں---- یا آگے بڑھتے جوانوں کو ڈھیر کر رہی تھیں، مگر اب تک دشمن رفیوجی کیمپ کے مضافات تک پہنچ پائے تھے!

"بٹالین اکیس یکجا ہو---- بٹالین اکیس یکجا ہو---- سب اسکول کے گراؤنڈ میں جمع ہوں!" وہ بہت احتیاط سے قریب کے اسکول کی طرف بڑھنے لگا۔

جس کا نقشہ اس نے صبح ہی دیکھا تھا وہاں کمانڈر الہیٰ اور دیگر فوجی پہلے سے موجود تھے! "ہمیں ہسپتال کا محاصرہ کرنا ہے"، الہیٰ نے کہا---- دشمن نے اس کے اندر پناہ لے رکھی ہے، حسین اور اسحاق تم لوگ پیچھے سے حملہ آور ہونا، ہم لوگ کورنگ فائر کریں گے! گولیوں کی بارش میں ہم لوگ اپنے ٹھکانے کی طرف رینگنے لگے---- پیچھے سے کمانڈر کی آواز بھی گولی کی طرح پیچھا کر رہی تھی" جلدی حسین---- جلدی، حملہ---- کہ یما!" وہ اندھا دھند گولیاں چلاتا ہوا آگے بڑھنے لگا، پہلی کھائی پار کرتے ہی وہ ایک مکان کی آڑ میں آنا چاہتا تھا کہ اچانک ایک آدمی سامنے آگیا اس نے اچھل کر اس پر وار کرنا چاہا، مگر اس نے اگلے کو سنبھال لیا اور کوئی گولی نہ چلائی، اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی سنگین تھی، "خاموش، میں بھی تمہاری طرح ایک فلسطینی ہوں"---- اس آدمی نے حیرت سے دہرایا---- فلسطینی، یعنی تم بھی یہودیوں کے خلاف---- "ہاں---- میں بھی---- میں تمہیں آگے بڑھنے کا راستہ دوں گا مگر پہلے اپنی سنگین سے میرے بازو پر کاری زخم لگاؤ!

مگر کیوں؟ حیرت سے اس شخص نے پوچھا! سوال کا وقت نہیں، میرے دائیں بازو پر زخم---- مگر یہ جان لو کہ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا!" تم اپنی مرضی سے یہاں کیسے نہیں آئے؟" اس شخص نے مزید حیرت سے پوچھا؟

"جب نوکری اور بقا کے سارے دروازے بند ہو جائیں اور دو وقت کی روٹی کے لئے فوج کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو کیا کر سکتے ہیں---" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو ننگا کر لیا، جلدی کرو---- وقت کم ہے! اور ہاں، دائیں طرف مڑ جانا راستہ صاف ہے، ابھی وہاں کوئی نہیں پہنچا ہے---- مگر میری چیخ کے ساتھ تم فرار ہو جانا---- اور یہ لو میری مشین گن، تمہارے کام آئے گی!" کیوں؟ تاکہ مجھ پر شبہ

نہ ہو اور نہ ہی میں خود کو مارنے پر مجبور ہو جاؤں! چلو جلدی کرو! اس شخص نے اپنی سانسیں کھینچ لیں اور بولا---- معاف کرنا بھائی---- جواباً اس نے سانسیں روک لیں اور دانت پیس لئے، پھر وہ درد سے چیخ اٹھا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا، تازہ اور گاڑھا خون اس کے بازو سے ابل پڑا-------!

جب اس کی آنکھ کھلی---- اسے اسٹیچر پر ہسپتال لے جایا جا رہا تھا! اس نے کمانڈر الہیٰ کو کہتے سنا:

"اس مردِ غازی کو ابھی بہت سی جنگیں لڑنی ہیں، اس کی جان بہت قیمتی ہے---- لے جاؤ---- اسے جلدی ہسپتال لے جاؤ!

"محاصرے کے بعد صبح صادق سے ذرا پہلے"

اکرم ہانیئے

(۱۹۵۳ء)

گرمیوں کی ایک خوشگوار صبح، پرانے شہر کی پر پیچ گلیوں میں---- سب سے پہلے جن لوگوں نے اس حادثے پر دھیان دیا وہ چار تھے، جو اتفاقاً ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے-----!

مزدوروں سے بھری اسرائیلی فیکٹریوں کو جاتے والی وین نے ابھی اینہ کو شہر کے مغربی کنارے پر اتارا تھا، اسے "دمشق گیٹ" کی طرف جانا تھا، جہاں وہ کسی مناسب چبوترے پر تازہ انجیروں کو بیچنے والی تھی، جس کا بوجھ وہ اپنے سر پر اٹھائے تھی----

روزانہ علی الصبح وہ اپنے گاؤں سے نکلتی تاکہ فیکٹری جاتے مزدوروں اور مقدس شہر میں داخل ہوتے ہجوم سے کچھ کما سکے---- اس بھیڑ میں ہر قماش، ہر فرقے کے لوگ ہوتے، خاص کر وہ زائرین جو شہر کے مقدس مقامات پر حاضری دینے آتے تھے!

ابوماذن ابھی تک نیند کے خمار میں تھا- وہ صبح کے اخبار کا بنڈل اٹھانے جا رہا تھا، جنہیں اسے چھوٹے دوکانداروں میں تقسیم کرنا تھا---- واپسی پر اسے اپنی دوسری چیزوں کو صلاالدین اسٹریٹ پر پہنچانا تھا!

سلیمان لپک کر سڑک پار کرتے ہوئے المسارہ والی بیکری کی طرف رواں تھا---- جہاں وہ کام کرتا تھا- اس سے پہلے کہ راستے طالب علموں اور مزدوروں

سے جام ہو جائیں وہ اپنے حصّے کے میدے کے کیک بنا لینا چاہتا تھا!

چوتھا شخص---- حاجی ابو فواد اپنی عادت کے مطابق صبح کی نماز پڑھنے اس وقت شہر آیا تھا---- شہر کے مختلف مقامات سے ایک ہی وقت، چاروں کی نگاہیں اس پر جا کر رکیں یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین منظر تھا۔ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا، ان کی آنکھیں حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے پھیلتی چلی گئیں! ان میں سے ہر ایک قربِ قیامت کی دہائی دینے لگا اور توبہ استغفار کے بعد خدا کا نام لینے لگا۔ ان چاروں نے اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ کہیں کوئی خواب تو نہیں؟ مگر حقیقت کا اندازہ ہوتے ہی، ہر ایک چیخ پڑا---- اور ان کی دل خراش چیخیں یروشیلم کی خاموش صبح میں گونج اٹھی!

ان میں سے ہر ایک نے اپنے خوف کا اظہار چیخ و پکار کی شکل میں کیا، جلدی آؤ---- لوگو جلدی آؤ---- بیت المقدس کا گنبد چوری ہو گیا دیکھو---- دیکھو گنبد غائب ہو گیا!

ان کی چیخ جوں ہی پرانے یروشیلم کی گلیوں میں گونجی---- بند دریچوں سے کچھ ناگوار آوازیں اور چند ایک گالیاں بھی سنائی دیں---- پھر آہستہ آہستہ پرانے دروازوں میں چابیاں کھڑکھڑائیں اور رفتہ رفتہ پرانے شہر کی گلیوں سے ہوتے ہوئے، سڑکوں پر لوگ جمع ہونا شروع ہوئے کہ صبح صبح یہ کیسی چیخ و پکار ہے؟

منٹوں میں شہر جاگ اٹھا---- اور لوگ ہر طرف سے ابلنے لگے---- ہر اک ہراساں---- ہر کوئی سوالی---- سارے متجسس! سڑکوں پر لوگوں کا ازدحام جمع ہو چکا تھا---- ان میں عورتوں اور بچوں کی کسمپرسی بھی عجیب تھی----! وہ سب گرتے پڑتے، دوڑتے ہوئے "دمشق گیٹ، جافا گیٹ، ھٹیا، الساحرہ، اور

السلسلہ گیٹ" سے ہوتے ہوئے جمع ہو رہے تھے! وہ آئے تھے "خان الزائد سے، کرسچین کوارٹر، آرمینین سیکٹر سے، وہ تکیہ ٹریک، مفتی ٹریک، سعادیہ کوارٹر، داوَد اسٹریٹ اور خدائر بارج" سے بھی آئے تھے! ان میں سے کچھ اپنے شب گزاری کے لباس میں تھے، کچھ منہ ہاتھ دھوئے بغیر نکل پڑے تھے اور ہر ایک کی متلاشی آنکھوں میں حیرت و یاس جھلک رہی تھی!

بارڈر گارڈ---- سپاہیوں اور پولیس کے عملے نے فوراً یروشیلم کے صدر دروازے اور دیوارِ گریہ کے آس پاس حسبِ معمول اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ مگر پرپیچ گلیوں میں داخل ہونے کی ہمت ان لوگوں نے نہ کی---- جو مقامی اس بھیڑ میں شامل نہ تھے، وہ پولیس کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ خلافِ معمول ہوا ہے۔ ایک منہ سے دوسرے تک خبر پھیلتی چلی گئی اور لوگوں کا بے چین سمندر حرم کے آس پاس مچلنے لگا! لوگوں کی چیخ و پکار ایک مکروہ شکل اختیار کر چکی تھی اور کوئی اس بھیڑ میں یقین نہیں کر رہا تھا یا نہیں کرنا چاہ رہا تھا جو کچھ ہوا تھا۔ جب وہ سب مسجدِ عمر پہنچے تو حقیقت عیاں تھی۔ حرم کا گنبد اپنی جگہ موجود نہ تھا---- جیسے کسی نے جادو کے زور سے غائب کر دیا ہو، مگر وہاں ذرہ برابر بھی کنکر یا مٹی کا نشان موجود نہ تھا کہ معلوم ہو سکے، بھلا یہ سب ہوا کیسے؟

چیخ کا دائرہ پھیلتا گیا، بے چین مجمع ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کہنی مارتا آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی طرح گنبد سے خالی مقام کو عقیدت سے چوم لے---- بہت سے بے ہوش ہو گئے---- کئی بھیڑ میں کچل گئے---- بچوں کی ہذیانی چیخیں بھی دل خراش تھیں، جو بھیڑ میں گھٹ رہے تھے، جن لوگوں نے اپنے حواس پر قابو رکھا تھا وہ بے ہوش ہوتی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر لے جانے میں مصروف تھے۔ کئی الم زدہ اپنے کپڑے پھاڑ کر زار و قطار رو رہے تھے!

کچھ ہی دیر میں مردوں کی ایک جماعت حرم کے دروازے پر نمودار ہوئی، یہ اسلامی کاؤنسل کے، وقف کمیٹی کے اور دیگر مذہبی اداروں کے رکن تھے! ان میں سے ہر ایک کو چُپ لگی تھی۔ حسرت و یاس نے ہر کسی کو گونگا کر رکھا تھا۔ اس بھیڑ میں بوڑھے شہری بھی تھے جو عموماً یہاں جمعہ کی نماز پڑھنے جمع ہوتے تھے۔ فقیروں کی بھی ایک ٹولی تھی جو حرم کے صحن میں سوتے تھے۔ ہر ایک کو دلی صدمہ پہنچا تھا، جیسے کوئی عزیز ان سے بچھڑ گیا ہو!

ہر طرح کے فقرے ابلے پڑتے تھے----

"وہ لوگ اس جگہ کوئی نئی آبادی بسانے کے چکر میں ہیں!"

"کوئی نیا کوارٹر یہاں بنانے کا منصوبہ ہوگا-----"

"شاید ان لوگوں کو اندر مطلوبہ گوریلے مل گئے ہوں اور ہمیں سزا دینے وہ اسے لے گئے----"

"ہو سکتا ہے عربوں نے جہاز بھیجا ہو اسے اڑا کر اپنی بستی میں نصب کر لینے کے لئے---- اس طرح عربوں کو بیت المقدس آزاد کرانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی---"

ہم لوگوں کو آج رات حرم میں گزارنا چاہیے---- کیا پتہ وہ لوگ ہمارے مقدس مزار یا کچھ اور چُرانے کی کوشش کریں"!

"ایک اسلامی سِمٹ کی ضرورت ہے---- نہیں عرب سِمٹ!" اور انہیں جہاد کا اعلان کرنا چاہیے"---- اور اس بات پر زور ڈالنا چاہیے کہ اقوام متحدہ کے ہنگامی اجلاس کی فوری ضرورت ہے"---- بیانات اور عرضیاں برسنے لگیں!

"اسرائیلی تو اب کسی پاگل اقلیت پر الزام لگائیں گے"

"شاہ خالد کا تاثر کیا ہوگا---- پہلے تھا کیا---"

"اور وہ--- پرہیزگار--- سیکولر--- انور سادات ان کا بیان کیا ہوگا"

"ان لوگوں نے اس چھپایا کہاں ہوگا"؟

"ان لوگوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے شہید کیا ہوگا"

"محافظ کہاں تھے"-- "کیا اب یہ لوگ یروشلم کا نام بدل دیں گے"----
اب ہم لوگ شبِ معراج کہاں منائیں گے"؟

لوگ ہر کونے سے جستہ جستہ حرم کے صحن میں جمع ہوتے رہے۔ ان میں سے بیشتر بارڈر گارڈ اور ان کے چنگلوں سے بچتے بچاتے پہاڑی راستوں اور پرپیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے آئے تھے! صبح سے یروشلم کی تمام سڑکیں گاڑیوں سے بھری پڑی تھیں---- اور جیسے جیسے ڈرائیوروں کو اس سانحے کی خبر مل رہی تھی، وہ اپنی گاڑیوں کو قابو میں نہ رکھ پا رہے تھے ہر کوئی بیت المقدس کی چھت کو گھور رہا تھا، اور اس طرح سڑک پر طرح طرح کے حادثے ہو رہے تھے!

اس روز---- ابتدائی ردِ عمل کے ماند پڑنے کے بعد، پرانے شہر کی فضا بڑی سوگوار سی ہو گئی---- گاؤں سے آئی ہوئی وہ عورت، جو عام طور پر سڑک کے کنارے اپنی سبزیاں لے کر بیٹھتی تھی، اس وقت خالی خالی سی خاموش بیٹھی تھی! اسے گاؤں واپس جانے کا بھی ہوش نہ تھا! ریستوران اور کیفے کے ویٹر جو عموماً باتونی اور ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے، اپنے فکر مند گاہکوں کے آس پاس چپ چپ کھڑے تھے! یہاں تک کہ جیب کترے بھی ان سیاحوں کی جیب پر ہاتھ صاف کرنے سے کترا رہے تھے، جو روز کے معمول کی طرح آج یہاں آ گئے تھے، شہر کے نوجوانوں نے خاتون سیاحوں پر جملہ کسنے یا پیچھا کرنے سے خود کو روک رکھا تھا۔ یہ قیاس آرائیاں بھی ہو رہی تھیں کہ اس سانحے کا سیر و سیاحت پر کیا اثر ہو گا؟ آج گلیوں میں ٹھیلا دھکیلتے قلیوں کی آواز بھی کوئی نہیں سن رہا تھا! گرما گرم

سیخ کباب، تازہ کیک، فلافل، صعتر اور تیسی کی سوختہ روٹی، مرچ مسالے اور میٹھے کنافا کی تیز خوشبو فضا سے غائب تھی، اس طرح دکانوں سے آتی تیز موسیقی کی آواز بھی خاموش تھی!

امینہ، ان چار لوگوں میں سے ایک تھی، جن کی نگاہ سب سے پہلے اس سانحے پر پڑی تھی---- وہ دمشق گیٹ کو جانے والی سیڑھیوں پر اداس بیٹھی فضا کو گھور رہی تھی۔ تازہ انجیروں پر بھنبھناتی مکھیوں کو اڑانے کا بھی اسے خیال نہ تھا! وہ اس دن کو یاد کر رہی تھی جب وہ پہلے پہل یروشیلم آئی تھی وہ سات سال کی تھی، اس کا باپ جمعۃ الوداع والی صبح اسے لے کر یہاں آیا تھا۔ یہ یاد کرتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس دن اس کے باپ نے ایک نیا جوتا اور زری والا جوڑا اسے خرید کر دیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ پھر وہ لوگ ایک حلوائی کے یہاں داخل ہوئے اور کنافا خرید کر کھایا تھا اور پھر اسے ایک سبزی فروش دوست کی دکان پر چھوڑ کر وہ نماز پڑھنے حرم میں گیا تھا۔ ہاں--- اسے اپنی پہلی حاضری کی چھوٹی بڑی تمام باتیں یاد تھیں اور پھر اس کے بعد وہ کئی بار باپ کے ساتھ، خوشیوں اور تہواروں میں یہاں آئی تھی! اسے اور یاد آیا کہ وہ اس مقدس شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ بھی آئی تھی۔ اپنے نئے گھر کی ضروری چیزیں خریدنے کی خاطر، اسے یاد تھا کہ وہ لوگ ایک مقامی ریستوران میں کھانا کھانے بھی گئے تھے، اور واپسی پر اس نے اپنی قریبی سہیلیوں کو شہر کی ساری تفصیلات بتائی تھیں! ایک آنسو، پلکوں سے اٹکتا اس کے گال پر پھسلتا چلا گیا---- آہ---- اس کا شوہر، جو اس کا چچازاد بھائی بھی تھا۔ مگر ۶۷ کی جنگ کے بعد ہر چیز بدل گئی تھی، اس کے شوہر کو اپنا کام چھوڑ کر اسرائیلی فیکٹری میں کام کرنا پڑا---- وہ بڑے جوش و خروش سے شہر کے ہنگاموں اور جلوسوں کا ذکر کرتا، اور ان دھماکوں کا بھی جو وقتاً فوقتاً شہر میں گونجا

کرتے، ایک عجیب تجس اور بے چینی اس پر غالب ہو جاتی---- پھر اس کا شوہر گرفتار کر لیا گیا اور اسے چار سال کی سزا ہو گئی---- اس پر بم سازی کا الزام زبردستی لگا دیا گیا تھا---- اس کے بعد کوئی چارہ نہ تھا، وہ خاندان کے باغات کے انجیر، انگور اور سبزیاں لے کر یروشیلم جانے لگی۔ اپنے اور دو بچوں کے پیٹ کی خاطر۔ شہر کی ساری رعنائیاں اس کے لئے اپنا اثر کھو بیٹھی تھیں! اس نے آس پاس دیکھا، سڑکیں گاڑیوں اور بسوں سے خالی ہو رہی تھی---- گاؤں کی کچھ عورتیں اس کے پاس ہی کھڑی تھیں، شاید یہ شہر کا صدر دروازہ بند ہو جانے سے پہلے یہاں آ چکی تھیں۔ چند افراد دمشق گیٹ کی سیڑھیوں پر سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا---- کیا یہ لوگ اس مقدس شہر سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں، جتنا میرا شوہر کرتا ہے؟ اس نے سر جھکا لیا اور اپنی نم آنکھیں دامن سے صاف کرنے لگی!

جہاں تک حاجی ابو فواد کا تعلق تھا، وہ حرم کے دروازے کے پاس بیٹھا تھا! اسے حقیقت کا اقرار کرنے میں بہت دیر لگی، اسے محسوس ہوا گنبد کے ساتھ اس کی جائے نماز، اس کی امیدیں، التجائیں، دعائیں سب کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ وہ چالیس سالوں سے یہاں نماز پڑھنے آتا رہا ہے، وہ یہاں کی ہر اینٹ اور پتھر کو پہچانتا تھا۔ پریشانیوں اور آزمائشوں کے وقت وہ ہرے صنوبر کے سائبان تلے بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ مگر گنبد کے غائب ہونے سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، جیسے اس کا ماضی اس سے بدظن ہو گیا ہو--- اسے رمضان کی راتیں یاد آئیں اور لیلتہ القدر کی یاد آئی، عید کی نماز اور خوشیاں یاد آئیں، اسے یاد آیا وہ منحوس دن جب مسجد الاقصیٰ میں آگ لگی تھی اور کیسے اس کے بدن میں بجلی کی سی تیزی آ گئی تھی، جب وہ پانی بھر بھر کر شعلوں کو

ٹھنڈا کرنے میں مدد کر رہا تھا---- انہیں خدا کا خوف بالکل نہیں---- وہ زیر لب بڑبڑایا تھا---- مگر---- اچانک اسے خیال آیا کہ اس حادثے کی تگ ودو میں آج صبح کی نماز قضا ہو چکی تھی- مگر آج اور بھی بہت ساری چیزیں قضا ہوئی ہیں---- آنسو کے دو گرم گرم قطرے اس کی داڑھی میں جذب ہو گئے---- وہ بس ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا!

حرم کے صحن میں ایک خلقت جمع تھی، لوگ مختلف گروہ میں بٹے چہ میگوئیاں کر رہے تھے، فضا میں ایک سوگوار خاموشی مسلط تھی، کہیں کہیں سے گھٹی گھٹی رونے کی آواز بھی آجاتی تھی، حاجی فواد نے بھانت بھانت کے چہروں پر نگاہ ڈالی اور تھوڑی قوت جمع کر کے بول اٹھا ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں---- شکر کرو کہ ہم لوگ اب بھی یہاں موجود ہیں!

صلادین اسٹریٹ پر ابو ماذن اسی جگہ بیٹھا تھا، جہاں وہ ہمیشہ اخبار و رسائل بیچا کرتا تھا- اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جل اٹھی تھیں وہاں آج کوئی اخبار اور رسالہ نظر نہیں آرہا تھا، ابھی وہ پریس سے اخبار اٹھا بھی نہیں پایا تھا---- کچھ لوگوں نے اس سے اخبار مانگا اور پوچھا کہ اس سانحے کی کوئی خبر چھپی بھی ہے یا نہیں؟ وہ بڑی نقاہت سے سر ہلا کر انکار کر دیا تھا-

خواہ موسم سرد ہو یا گرم، وہ علی الصبح اپنے گھر سے نکل جاتا، وہ دروازہ کھولتے ہوئے اپنے سوتے بچوں اور بیوی پر ایک نگاہ ڈالتا اور بیوی کی ہدایت کے مطابق اپنے سر کو اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے باہر نکل جاتا! راستے میں جیسے ہی مسجد کا گنبد اس کی نگاہوں کے سامنے آتا، خود بخود اس کے ہونٹ "اللہ اکبر" سے کانپتے، ساتھ ہی دیگر دعائیں جو اسے یاد آتیں پڑھتا، اس عادت نے ایک شدت اختیار کر لی تھی---- مگر آج کے بعد، صبح مختلف ہوا کرے گی اور وہ کسی نئے طور طریقے کو

اپنانے پر مجبور ہو گا---- مگر اس نے خود سے سوال کیا پہلے ہی طور طریقے اور رسومات ادھر چند سالوں سے بدل نہیں گئے ہیں؟ اور شہر کی ہوا؟ کیا خود سڑکیں اجنبی بوٹوں کی دھمک پر احتجاج نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا میں خود کو ان سڑکوں پر اجنبی محسوس نہیں کرتا ہوں؟ اپنے بیٹے ماذن کی شبیہہ اس کی نظروں میں گھوم گئی---- وہ شیطان پتہ نہیں اس وقت کیا کر رہا ہو گا--- شاید وہ اپنے طالب علم ساتھیوں کے ساتھ جلوس میں احتجاج کرنے گیا ہو اور گرفتار کر لیا گیا ہو! کیا مجھے پھر اس کی ضمانت کے لئے جرمانہ ادا کرنا ہو گا؟ اس کا دل دھڑکا پھر اچانک خوشی کی ایک لہر نے اس کے غم کو کچھ ہلکا کر دیا۔ اس کی یروشیلم کی پرانی مگر پروقار دیواروں کو دیکھا اور زیر لب گویا ہوا---- اوہ--- ہمارے نوجوان--- انہیں یروشیلم سے محبت ہم لوگوں سے کئی درجہ زیادہ ہے!

سلیمان ابھی اپنی بیکری تک پہنچ ہی نہ پایا تھا جافا گیٹ کے کافی ہاؤس کی ایک کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ آج صبح شاید کسی کو بھی بھوک نہیں۔ اس نے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگانے جا رہا تھا کہ اسے یاد آیا کہ صبح سے اس نے کچھ کھایا نہیں ہے---- اس نے ایک کافی مانگنا چاہی، مگر اس نے دیکھا کہ سارے گاہک اور ویٹر خاموش بیٹھے کسی خیال میں گم ہیں، اس نے اپنا ارادہ ترک کیا اور سگریٹ سلگا لیا!

سلیمان نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار نماز پڑھی تھی اور وہ بھی بیت المقدس میں---- مگر اسے پورا احساس تھا کہ صبح ایک مقدس شے سے اس کا شہر محروم ہو گیا ہے، بچپن میں وہ دوستوں کے ساتھ حرم جایا کرتا تھا یا پھر اسکول کے گروپ کے ساتھ گیا تھا، وہ جمعہ اور عید کی نماز کی بھیڑ دیکھنے بھی جاتا تھا۔ وہ کبھی نماز نہ پڑھتا مگر بیت المقدس کے لئے اس کے دل میں ایک خاص قسم کی حرمت

تھی--- وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ وہ حرم کے قریب پرانے شہر میں
رہتا ہے--- آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ماضی کا ایک اہم باب ختم ہو
گیا، مر گیا ہے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے پرانے شہر کی گلیوں اور چوراہوں پر کوئی
کشش باقی نہیں رہی تھی۔ قدیم یروشیلم کی دیوار بھی اپنی روزمرہ کی رونق سے محروم
تھی اس نے خود سے سرگوشی کی، پچھلے چند سالوں سے میں یہاں خود کو اجنبی
محسوس کرنے لگا ہوں--- یہ وہ یروشیلم نہیں جسے وہ جانتا تھا، اس نے خاموش مجمع
پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالی---- وہ گنبد بھی جو صبح غائب ہو چکا ہے ویسا نہیں رہا تھا
جیسا میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں----- اس نے سگریٹ کا آخری سرا زمین پر
پھینکا اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا--- دھواں اس کے حلق میں پھنستا محسوس
ہوا--- زندگی گزرتی جا رہی ہے اور ہم نے اب تک کیا حاصل کیا؟ تلخی کے ساتھ
اسے یاد آیا--- خاندان کی تنگ دستی نے اسے یونیورسٹی جانے نہیں دیا،
حالانکہ اس کے اسکول کا نتیجہ شاندار ہوا تھا--- پھر وہ سالوں ایک اسرائیلی
فیکٹری سے دوسری تک خود کو گھُلاتا رہا--- آخر تنگ آ کر اس نے ایک رشتہ
دار کی بیکری میں نوکری کر لی اور آج تک وہیں ہے جہاں سے شروع ہوا تھا---
زمین پر اس نے اپنا پاؤں پٹخا۔ اس نے اکثر ہجرت کا ارادہ کیا پھر ترک کر دیا شاید
اس کی جڑیں اس زمین میں بری طرح پیوست تھیں۔ زندگی تیزی سے گزرتی رہی
مگر وہ بیکری کے تنور میں جھلستا رہا! اس کی ماں روزانہ فجر کی نماز میں اس کے لئے دعا
کرتی--- وہ بڑی عاجزی سے خدا کے حضور گڑگڑاتی---- میرے مالک، میرے
بچے کی مدد فرما--- مگر وہ وہیں رہا--- تنور میں جھلستا--- اور کچھ بھی نہ بدلا----
اس نے نگاہیں اٹھا کر یروشیلم کی دیواروں کو دیکھا، جہاں گارڈ ہتھیار سے لیس تیار
کھڑے تھے! اس نے خود سے کہا--- یہ تو وہ زندگی نہیں، جو میں گزارنا چاہتا

تھا---- پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا-----:

"شاید میرا ایمان کامل یا کافی نہیں تھا--- شاید مجھ میں ہی کوئی کمی تھی----"

جب رات ڈھلی، پرانے شہر کے باشندے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے---- کئی حرم کے صحن میں سونے کی غرض سے چلے گئے باقی---- خاص کر عورتیں اور بچے گھروں کو واپس لوٹ گئے سپاہیوں نے دیواروں کی نگرانی سخت کر دی---- مگر پُر نور ستارے آسمان پر چمکتے رہے--- گلیاں بھاری بوٹوں کی دھمک سے لرز اٹھیں!

بارھواں باب

مسجدِ اقصیٰ (عکاسی : خالد سہیل)
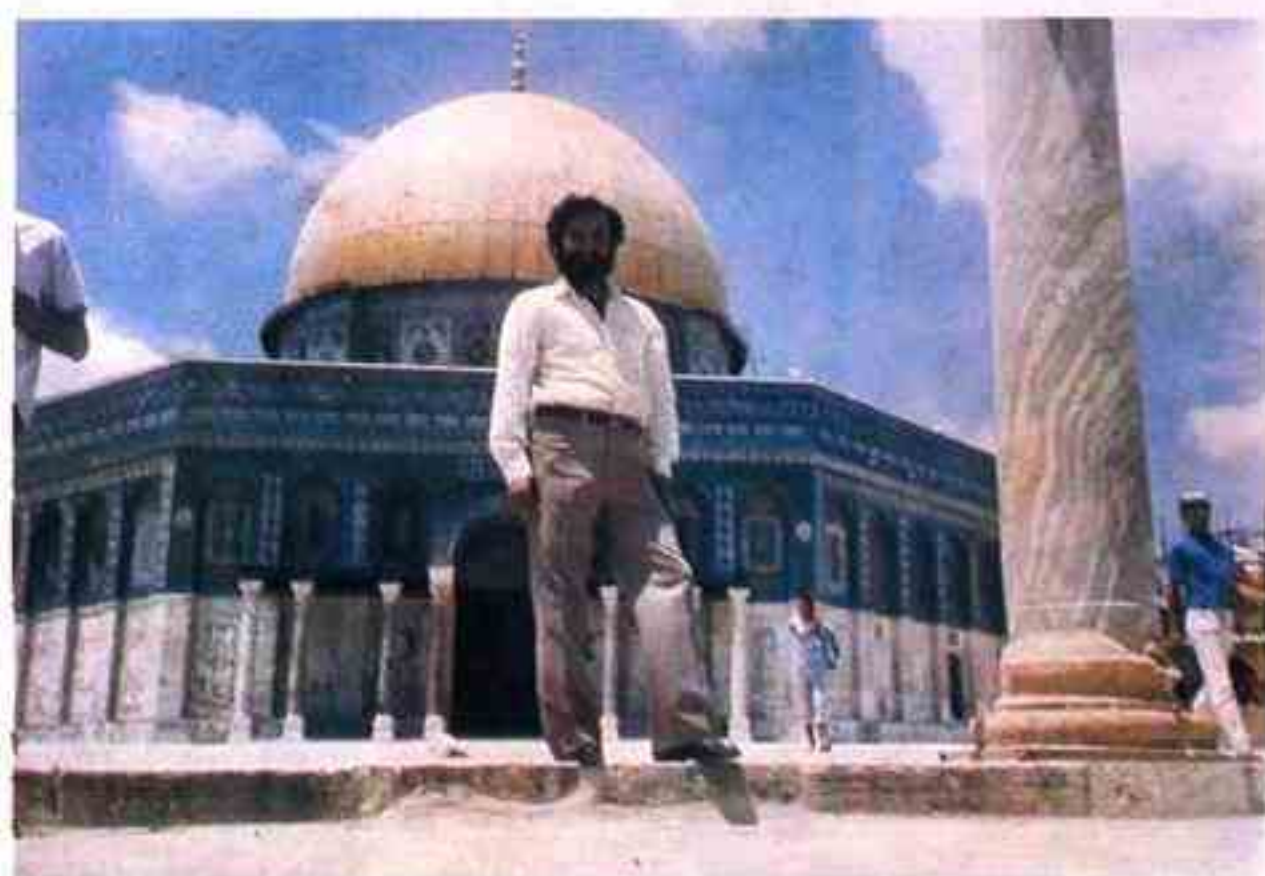
مسجدِ اقصیٰ میں حاضری - خالد سہیل

اُمید کی کرن

میراو سے دوسری ملاقات ہوئی تو قدرے بے تکلفی بڑھی جب ہم شام کا کھانا کھا رہے تھے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔

"میراو اگر اجازت ہو تو کچھ پوچھوں۔"

"پوچھو" اس کی آنکھیں مسکرائیں۔

"پوری مسلم دنیا یہودیوں کے خلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل ایک جابر قوم ہے۔ فلسطینیوں پر دن رات ظلم کرتے رہتے ہیں دو جنگوں میں انہوں نے فلسطینیوں کے علاقے قبضہ کر لئے ہیں۔ اور انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھ رہے ہیں خود تو جمہوریت پر ناز کرتے ہیں لیکن فلسطینیوں کے لیے جان تک دینے کو تیار ہیں مجھے ایک پاکستانی شاعر منیر نیازی نے ایک فلسطینی شاعر کی نظم کا اُردو ترجمہ سنایا تھا جو کچھ یوں تھا:

میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے ہتھیاروں کے ساتھ
میرے دشمن میرے ہتھیار مجھ سے چھین لیں گے

میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے ہاتھوں کے ساتھ
وہ میرے ہاتھ کاٹ دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے بازوؤں کے ساتھ
وہ میرے بازو کاٹ دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے جسم کے ساتھ
وہ مجھے قتل کر دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنی روح کے ساتھ

میراو! تم ایک روشن خیال عورت ہو تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟
میراو کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولی "سہیل اسرائیل ایک بحران کا شکار ہے ہم دوراہے پر کھڑے ہیں ایک طرف وہ پرانی نسل ہے جس پر ہولوکاسٹ میں ظلم ہوئے انہوں نے قربانیاں دیں اور خون کی ندیاں بہا کر یہ ملک حاصل کیا اور جب ملک بن گیا اور ان کے پاس سیاسی طاقت آ گئی تو ان کی آنکھیں چندھیا گئیں مظلوم خود ظالم بن گئے اور ایسا تاریخ میں کئی دفعہ ہوا ہے انہوں نے فلسطینیوں ساتھ وہی سلوک کیا جو جو برسوں سے ان کے ساتھ خود ہوتا آ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ نوجوان اسرائیلی ہیں جو اسرائیل میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں ہم حکومت کی پالیسیوں کے خلاف ہیں یونیورسٹی کے بہت سے نوجوان اور عوام ہمارے ساتھ ہیں ہم مذہبی جنون اور سیاسی تشدد کے خلاف ہیں ہمارا خیال ہے کہ ظلم صرف مظلوم کے لیے ہی نہیں ظالم کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں ہم فلسطینیوں کو ان کا حق دینے کے حق میں ہیں۔

پھر وہ خاموش ہو گئی اور اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک کاغذ نکالا اور مجھے تھما دیا وہ تحریر عربی میں تھی "یہ کیا ہے؟"

"یہ ایک نظم ہے جو میرے ماموں نے دی ہے میرے ماموں ایک ہارٹ سرجن ہیں اور برسوں سے ریڈ کراس کے ساتھ منسلک ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ایک زخمی اسرائیلی فوجی آیا جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا وہ (West bank) پر کئی مہینے لڑتا رہا تھا اور کئی فلسطینیوں کو ہلاک کر چکا تھا لیکن مرنے سے پہلے بہت نادم تھا اس نے وصیت کی تھی کہ اس کا دل کسی فلسطینی کو تحفتاً پیش کیا جائے۔

چنانچہ انہیں (West Bank) کا ایک فلسطینی ملا جو گھر سے بچوں کے لیے دودھ لینے نکلا تھا اور اسرائیلی فوجیوں کی گولی کی نذر ہو گیا۔ اس کی نیم مردہ لاش کو ہسپتال لایا گیا اس کی زندگی کو صرف نئے دل سے بچایا جا سکتا تھا چنانچہ میرے ماموں نے اسی اسرائیلی فوجی کا دل اس فلسطینی شہری کے سینے میں لگا دیا اور وہ بچ گیا۔

"لیکن یہ نظم ----؟" میں نے پوچھا۔

"یہ نظم اسی اسرائیلی فوجی کی ہے جو اس نے مرنے سے دو دن پہلے لکھی

تبھی پھر اس نے اس نظم کا ترجمہ سنایا جو کچھ یوں تھا:

میرا دل
تحفہ ہے
ایک فلسطینی شہری کے نام
جو اپنے حق کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہوا
میرا دل
خوں بہا ہے
ان لاکھوں یہودیوں کا جو جرمنوں کے ہاتھ مارے گئے
اور ان
ہزاروں معصوم فلسطینیوں کا
جو یہودیوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے
میرا دل
ایک آرزو ہے
اس دن کی جب
ساری دنیا اسرائیل کو
اور
اور اسرائیل فلسطین کو
دل سے قبول کر لے گا
میرا دل
امید ہے

اس شہر کی
جہاں اسرائیلی اور فلسطینی
ایک باپ کی اولاد
ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر نہیں
دوست اور ہمسائے بن کر رہیں گے

ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر وہ بولی "سہیل! یہ نظم ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے تم یقین مانو کہ ان نوجوانوں کی تعداد جو فلسطینیوں کو ان کے علاقے واپس کر دینے کے حق میں ہیں بڑھتی جا رہی ہے ایک دفعہ وہ نسل برسرِ اقتدار آ گئی تو اسرائیل مشرقِ وسطیٰ اور عالمی امن کا رخ بدل جائے گا"

("امن کی دیوی" میں سفرنامہ اسرائیل کے چند اقتباسات)

تیرھواں باب

امن کی طرف پہلا قدم

(عرفات اور ربین سے انٹرویو)

(یٹزک رابین سے ٹائم میگزین کے نمائندے لیسا بیر کے انٹرویو سے چند اقتباسات)

سوال: آپ نے فلسطینیوں کے ساتھ امن کے معاہدے پر دستخط کر دیے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟

جواب: اصل امتحان اس معاہدے کے عملی جامہ پہنانا ہو گا خاص کر گازا (Gaza) کے علاقے میں۔ جیریکو (Jericho) کے علاقے کا امن علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ گازا کے علاقے میں سات آٹھ لاکھ فلسطینی معاشی اور معاشرتی مسائل کا شکار ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا پی ایل او (P.L.O) کی تنظیم اس قابل ہے کہ ان مسائل کا حل تلاش کر سکے حالات کو بہتر بنانے کے لیے انہیں عوام کے لیے گھر، سکول اور کارخانے تعمیر کرنے ہوں گے امن کا مستقبل انہی اقدام پر منحصر ہے۔

سوال: آپ کا فلسطینیوں کی خودمختاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: مجھے امید ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے لیکن وہ کام خارجی مالی امداد کے بغیر ممکن نہیں۔

سوال: اگر اسرائیل میں دائیں بازو کے لوگوں نے معاہدے کے خلاف بغاوت کی تو آپ کیا کریں گے؟

جواب: میرا نہیں خیال کہ بغاوت ہو گی۔ اگر مخالفت ہوئی بھی تو مجھے امید ہے کہ

ہماری حکومت جو فیصلے کرے گی ان پر عمل ہو گا۔

سوال: آپ کے خیال میں یہ معاہدہ آپ کے شام، لبنان اور اردن کے ساتھ رشتے کو کیسے متاثر کرے گا؟

جواب: ہمیں امید ہے کہ وہ بھی اس معاہدے میں ہمارا تعاون کریں گے اردن کے ساتھ مفاہمت آسان ہو گی اور ہمیں امید ہے کہ اس کے بعد ہم شام سے بھی مذاکرات کر سکیں گے۔

سوال: آپ نے عرفات کے ساتھ جب ہاتھ ملایا تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟

جواب: وہ آسان نہیں تھا۔

سوال: آپ نے کس مرحلے پر یہ فیصلہ کیا کہ آپ پی ایل او کو مذاکرات میں شامل کریں گے؟

جواب: ہمیں اس موضوع پر کافی غور و خوض کرنا پڑا تھا۔ پی ایل او کے ساتھ ہمارے تعلقات تیس سال سے کشیدہ چلے آرہے ہیں لیکن جب ہمیں احساس ہوا وہ سنجیدگی اور خلوصِ دل سے امن کرنا چاہتے ہیں تو ہم نے بھی اپنا رویہ بدلا۔

سوال: آپ کی عمر ۷۱ سال کی ہو گئی ہے اور اب آپ اپنی سیاسی زندگی کے آخری مراحل میں ہیں کیا اس حقیقت نے آپ کے مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا ہے؟

جواب: سوال میری عمر کا نہیں بلکہ سیاست میں میرے مقاصد کا ہے جب میں وزیرِاعظم بنا تھا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ بین الاقوامی سطح پر جو تبدیلیاں آ رہی ہیں انہوں نے اسرائیل کے لیے امن کی طرف ایک قدم بڑھانے

کے لیے ماحول سازگار کر دیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے مقاصد کو بدلیں ہم اپنا وقت، دولت اور توانائی اپنی سرحدوں کی حفاظت کی بجائے عوام کی معاشی، معاشرتی اور سائنسی ترقی پر خرچ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسرائیلی تحفظ کے ساتھ ساتھ خوشحال زندگی بھی گزار سکیں۔

یہ امن کا معاہدہ انہی مقاصد کی طرف پہلا قدم ہے۔

(یاسر عرفات سے ٹائم میگزین کے نمائندے ڈین فشر کے انٹرویو سے چند اقتباسات)

سوال: آپ نے اسرائیل کے ساتھ امن کے معاہدے پر دستخط کر دیے ہیں اب کیا ہوگا؟

جواب: ہمیں ابھی بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ ہمیں اپنے بھائیوں اور دوستوں کے علاوہ ان تمام لوگوں سے بھی مدد کی ضرورت ہے جو اس علاقے میں دائمی امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ امن اگرچہ فلسطین کی ضرورت ہے لیکن یہ اسرائیل، امریکہ، روس اور عرب ممالک کی بھی ضرورت ہے دنیا کی ہر طاقت اس علاقے میں دلچسپی رکھتی ہے کیونکہ اس علاقے میں تیل کے ذخائر ہیں۔ لیکن میں پُرامید ہوں۔ میں صدر کلنٹن کے مہربان رویے سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ امریکہ کے صدر کے اختیار میں ہے کہ وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو ایک حقیقت بنا دے۔

سوال: فلسطینی عوام اس وقت کیا محسوس کر رہے ہیں؟

جواب: وہ جشن منا رہے ہیں۔ بعض حلقوں نے امن کے معاہدے پر اعتراضات بھی کیے ہیں لیکن اس صدی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس علاقے کے لوگوں کی اکثریت نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ فلسطینی ریاست کا قیام امن کے لیے ناگزیر ہے۔

سوال: کیا آپ کو شدت پسند عناصر سے خطرہ نہیں جو اس معاہدے کے حق میں نہیں ہیں؟

جواب: نہیں مجھے خطرہ نہیں کیونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ فلسطینی عوام کی

اکثریت چاہے وہ مقبوضہ علاقوں کے اندر رہ رہی ہو یا باہر اس معاہدے کے حق میں ہے۔

سوال: آپ حزبِ اختلاف کے ساتھ کیا کریں گے؟

جواب: ہم ان کے ساتھ ایک مکالمے میں شریک ہونا چاہتے ہیں ہم یمن میں عنقریب ملیں گے اور مذاکرات کریں گے میں نے اس بات پر بھی اصرار کیا ہے کہ ان کے لیڈر شیخ احمد یاسن کو رہا کیا جائے ہم اپنی کامیابی کا تحفظ چاہتے ہیں۔

سوال: کیا آپ دیگر عرب ممالک سے درخواست کریں گے کہ وہ بھی اسرائیل سے امن کا معاہدے کریں؟

جواب: اردن نے دستخط کر دیے ہیں مجھے امید ہے کہ شام اور لبنان بھی اردن کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

سوال: کیا آپ ایسا جلد کریں گے؟

جواب: جی ہاں۔ لیکن یہ معاہدہ ایک خود مختار فلسطینی ریاست کی طرف پہلا قدم ہے جو اردن اور فلسطین کے لوگوں کی باہمی رضامندی سے ایک کنفڈریشن کے طور پر معرضِ وجود میں آئے گا۔ ہم اس مقصد کے لیے ایک کمٹمنٹ رکھتے ہیں۔

سوال: بعض لوگوں کو یہ خطرہ ہے کہ ٹیونس میں پی ایل او کے لیڈر اور مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی رہنما آپس میں مل کر کام نہ کر سکیں گے؟

جواب: ان لوگوں کو ہمارے تعلقات کا اندازہ نہیں۔ اب ہمیں مل کر کام کرنا ہو گا تاکہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔

سوال: فلسطینی اور اسرائیلی برسوں سے ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں آپ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسرائیل سے جنگ لڑتے رہے ہیں آخراب کیا تبدیلی آئی کہ آپ امن کے معاہدے کے لیے تیار ہو گئے؟

جواب: میں کئی برسوں سے اسرائیلیوں کے ساتھ امن کے مذاکرات کرنا چاہتا تھا لیکن ایسے مذاکرات کے لیے جرأت مند لوگوں کی ضرورت تھی جو عرفات اور ربین کی صورت میں پوری ہوئی جنگ شروع کرنا آسان ہے لیکن امن قائم کرنا مشکل ہے۔ ہمارے چاروں طرف ایک نئی دنیا معرضِ وجود میں آرہی ہے اور ہم فلسطینی اور عرب اس نئی دنیا کی تشکیل میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔

جاوید دانش کی تصانیف
پرومیتھس (ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ)
آوارگی (یورپ اور امریکا کا سفر نامہ)
کالے جسموں کی ریاضت (افریقی ادب)
مزید آوارگی (جاپان، ہانگ کانگ، بنکاک کا سفر نامہ)
ورثہ (عالمی لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)
ہجرت کے تماشے
(شمالی امریکہ میں مقیم تارکینِ وطن کے دکھ سکھ کے ڈراموں کا مجموعہ)
ایک باپ کی اولاد (عرب، یہودی مسائل)
زیرِ طبع
دنیا کی نوٹنکی (عالمی ڈراموں کا انتخاب و ترجمہ)
ہجرتوں کے بعد (نظموں کا مجموعہ)
صنوبروں کے شہر میں (ڈائری)